

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222785

UNIVERSAL
LIBRARY

۵) حقوق محفوظ ہیں ۶) سلسلہ اشاعت نمبر

ہر رس نہ ثنا سبندہ رازست و گرنہ
اینها ہمہ رازست کہ معلوم عوام است

صحیفہ ادب

معنی

فن شاعری کی حقیقت، اسے رندائے سخن میں راقالب کے دیوان اور دیگر

پسیدہ مقدمہ

ترتیب و توفہ

شیخ عبدالرحمن طارق منشی فاضل

دارالتالیف ہندیکئی و ڈازہ لاہور سے شائع ہوئی

۱۹۳۵ء

اول دو ہزار جلد



حیدرآباد ایک ڈپو، حیدرآباد دکن

انتساب

ہر اُس محترم دوست کے نام جو اپنے دلی میں زبان و ادب
 کے فروغ اور مذاق سلیم کی حمایت کے لئے سچا جوش رکھتا ہو :-
 جانم بھلائے آنکہ او اسل بود سرور قدمش اگر ختم ہوسل بود
 خواہی کہ بدانی بے یقین دوزخ بود دوزخ بجاں صحبت نا اہل بود
 یہ عمومیت اور مساوات میں ہے اس لئے قائم نہ کی کہ یہاں کا
 معیار شرافت محض حسنِ ذوق ہے، اور جو لوگ اس نعمتِ عظمیٰ
 سے محروم ہیں، وہ اس ضمن میں کسی رعایت کے مستحق نہیں، اگر
 ایک مردہ انسان کسی زندہ شخص کے مساوی نہیں ہو سکتا، تو ہم بھی ان
 سے مجتنب اور کنارہ کش رہنے پر مجبور ہیں :-

گر بزدادِ صفتِ ماہر کہ مروغوغا نیست
 کہے کہ گشتہ نہ شد از قبیلہٗ مانیت

طارق

مطلع نظر

ہاتھ نے ایک روز مجھے تحریری خدمات پر آمادہ ہونے کی ترغیب
ان الفاظ میں دلائی :-

برکعت و خیاں پیچ بر کوہ و بیاں پیچ
برقے کہ بخود پیچد میر و بساب اندر

اس رُوح افزا پیغام کو شک کہ جس حُسنِ عقیدت اور جوشِ تسلی
سے میں نے اس کا استقبال کیا، اور اسکے بعد جو مطلع نظر کم از کم
اپنے لئے تجویز کر سکا، وہ حسبِ ذیل ہے :-

در دشتِ جنون من جبریلِ زبولِ صیڑے
یزدواں مکنند آدرائے ہمتِ مردانہ!

فہرست

صفحہ	مضمون	شمار	صفحہ	مضمون	شمار
۷۹	عشقِ حقّیہ	۸		دیباچہ	
۷۸	صوفیانہ	۹	۱	عرضِ حال	
۸۲	اخلاقیات	۱۰		بابِ اول	
۸۸	فلسفیانہ	۱۱		مبادیات	
۱۰۴	بہارِ تہ	۱۲	۲۹	علمِ انفس	۱
۱۰۵	شوخی اور طراقت	۱۳		شعر کی ماہیت اور	
۱۰۹	وجدِ نیا	۱۴	۳۲	شاعری کے لوازمات	۲
۱۱۷	محاکات	۱۵	۳۶	فصاحت	۳
۱۲۸	آرٹ	۱۶	۴۱	بلاغت	۴
۱۳۶	تخیل	۱۷	۵۱	شعر کی ماہیت	۵
۱۵۲	موسیقی اور ترنم	۱۸	۵۷	بعض دیگر شہرہاں	۶
۱۶۱	تبشیریں اور استعارات	۱۹	۶۶	آمد اور آمدِ مینق	۷
۱۷۴	الفاظ اور ترکیبیں	۲۰		بابِ دوم	
۱۷۶	بلاغت	۲۱		مرزا کی شاعری	

صفحہ	مضمون	شمار	صفحہ	مضمون	شمار
۲۰۸	تسل اور روانی	۲۶	۱۸۹	حسن استلال	۲۲
۲۱۰	صنائع بدائع	۲۷	۱۹۹	معنی آفرینی	۲۳
۲۱۷	فلسفہ غم	۲۸	۲۰۵	سہل ممتنع	۲۴
۲۲۰	خاتمہ	۲۹	۲۰۷	زورِ کلام	۲۵

تقریرات

کہتی ہے ہم کو خلق خدا غائب بنا کیا!

ذیل میں ہم وہ تمام خیالات اور تاثرات ناظرین کی خدمتیں پیش کئے دیتے ہیں، جو صحیفہ ادب اور خود ہمارے لائحہ عمل کے متعلق بعض مقتدر اور صاحب ذوق حضرات کی طرف سے یونیورسٹی کے طور پر موصول ہوئے ہیں، ہم ان تمام صاحبان کے ایلئے بھی خاص طور پر ممنون ہیں، کہ انہوں نے متعلق اور واقعات کا اظہار انتہائی فراخ دلی سے کیا ہے، اور اس میں کسی طرح کی رقابت کو قطعاً دخل نہیں دیا، ہم اپنے مقاصد کی وحدت اور ذوق عمل کی اس مبارک جستجو کو ملحوظ رکھتے ہوئے دنیا ئے صحافت سے بھی متوقع ہیں، کہ وہ انہیں زرین اصولوں پر کار بند رہتے ہوئے رواداری اور یگانگت کا پورا پورا ثبوت ہم پہنچائیگی۔

(مصنف)

از جناب حافظ سید طلحہ صاحب ایم اے

پروفیسر پنجاب یونیورسٹی انٹریل کالج لاہور
 ”ہمارے دوست جناب عبدالرحمن صاحب طارق نے صحیفہ ادب کے

تحریر فرمایا ہے جس میں زبان اردو کی موجودہ حالت اور اہل وطن کی اس سے بے اعتنائی کا ذکر نہایت دلنوی سے کیا ہے، اور ساتھ ہی ان اسبابِ علیل پر بھی روشنی ڈالی ہے، جو اردو زبان اور اردو ادب کی ترقی کی راہ میں حائل ہوئے ہیں، اصل کتاب میں پہلے شعر کی حقیقت اور شعر و شاعری کے لوازم سے بحث کی گئی ہے، جو بہت دلچسپ اور پُر از معلومات ہے، اسکے بعد مرزا غالب کی شاعری پر مختلف نقطہ نظر سے تبصرہ کیا گیا ہے، غالب کی شاعری پر تنقید و تبصرہ کا رواج آجکل بہت عام ہو رہا ہے، لیکن ہمیں شک نہیں، کہ طارِق صاحب کا تبصرہ بہت سی جہتوں کا حامل ہے، اور میری رائے میں یہ نئی طرز کے تنقید نگاروں کے لئے بہت کارآمد ثابت ہوگا۔ کتاب کی افادہ حیثیت کے علاوہ مصنف کا انداز بیان اچھوتا اور دلکش اس قدر ہے کہ اردو کے ہی خواہوں کو نافع مصنف کی محنت کی دل کھول کر داد دینی چاہیئے، میں جناب طارِق کی مزید کامیابیوں کیلئے دعا گو ہوں۔

از جناب مولانا علم الدین صاحب سالک ایم اے
پروفیسر اسلامیہ کالج ہلکھوڑ

”میرزا غالب ہندوستان کے وہ جلیل القدر شاعر ہیں جنکی شاعری نے دوست اور دشمن دونوں کے دلوں کو مستحضر کر لیا ہے، جوں جوں وقت گزرتا جائیگا، غالب کی شاعرانہ قدر و منزلت بڑھتی جائے گی، ایک وقت

تھا، کہ میرزا غالب خود لوگوں کی بے توجہی اور ناقدر دانی سے متاثر ہو کر
کہا کرتے تھے :-

تو لے کر محو سخن گستران پیشینی
مباحث منکر غالب کہ در زمانہ تست
یا اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں اس طرح فرمایا کرتے تھے :-
رخ فروشم در تموز و کلبہ دور از چار سہو
میر و سرمایہ از کف تا خریدارے رسد

یا آج یہ حال ہے کہ میرزا غالب کا دیوان اپنے پاس رکھنا فیشن میں
داخل، اور اُس کے کلام کی شرح لکھنا معیار قابلیت بن گیا ہے، چنانچہ
تھوڑے ہی عرصہ میں غالب کے کلام کی بہت سی شرحیں شائع ہو گئی ہیں،
لیکن مرزا غالب کی شرح نگاری یہیں ختم نہیں ہو جاتی، اس کا سلسلہ
بدستور جاری ہے، حال ہی میں ایک نوجوان ادیب جناب طارق نے
”صحیفہ ادب“ کے نام سے ایک کتاب شائع کی ہے، جس میں مرزا غالب
کے شاعرانہ محاسن گناتے ہوئے آپ نے جا بجا مشکل اشعار کی شرح
بھی کر دی ہے، کتاب مذکورہ دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں فاضل
مصنف نے شعرو شاعری پر ایک پرمغز مقالہ لکھا ہے، جس میں مشرق
مغرب کے مستند نقادان فن کی کتب سے استفادہ کرنے کے علاوہ
ذاتی اجتہاد سے بھی کام لیا ہے، شعرو شاعری کی یہ بحث بہت دلچسپ
اور عمدہ ہے، اس کا مطالعہ فن شعرو سے دل بستگی رکھنے والوں کیلئے فائدہ

سے خالی نہ ہوگا، فنی مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے آپ نے ہر جگہ مرزا غالب کے کلام سے استناد کیا ہے، جس سے مضمون ہمیدہ و لادینہ بن گیا ہے۔

دوسرا حصہ خاص میرزا کی شاعری سے متعلق ہے، اس میں بھی ہمارے نوجوان ادیب نے خوب ہی داد و سخن دی ہے، اور مختلف عنوانات کے ماتحت غالب کے کلام پر دل کھول کر بحث کی ہے، آپ نے غالب کے کلام کا موازنہ مشرق و مغرب کے دوسرے شعراء سے بھی کیا ہے جس سے آپ کے وسعت مطالعہ کا پتہ چلتا ہے، غرض کتاب میں جدیدیت کی روح ہر طرح کا رفرما ہے، خدا کرے اسے وہ مقبولیت حاصل ہو، جس کی یہ بدیہہ ناست مستحق ہے۔

از جناب صوفی غلام مصطفیٰ صاحب تبسم ایم اے
لیکچرار گورنمنٹ کالج لاہور

”میں نے منشی عبدالرحمن صاحب طارق کی تصنیف ”صحیفہ ادب“ کا مطالعہ کیا، اس کتاب میں مصنف موصوفہ نے اردو شاعری اور اس کے بعد مرزا غالب کی شاعری پر کسی قدر تفصیل سے بحث کی ہے، اسی ضمن میں بعض نہایت اہم امور بھی زیر بحث آ گئے ہیں جو اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے بہت کارآمد ہیں، مرزا غالب کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے بعض نہایت مفید باتیں بیان کر دی ہیں، جن سے

شرق کے اس جلیل القدر شاعر کی ادبی حیثیت متیقن ہو گئی ہے۔
 جناب طامق کی یہ ادبی کوشش قابل قدر ہے۔

از جناب صاحب قاضی فضل حق ایم اپنی ایس لیکچرار گورنمنٹ کالج لاہور

میں نے صحیفہ ادب کا بغور مطالعہ کیا، کتاب بہت پسند آئی، فاضل مصنف نے نفسیات شعری کو نہایت خوبی سے پیش کیا ہے، اسکے علاوہ طرز تنقید میں بھی ایک ایسی جدت اور دلاویزی پیدا کر دی ہے جو ملک کے نو تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے بھی اپنے اندر جاذبیت اور دلچسپی کا کافی سرمایہ لئے ہوئے ہے،

اس سے پہلے بھی بعض لوگوں نے غالب کی شاعری پر کچھ نہ کچھ لکھا ہے، لیکن اس کا کیا علاج کہ اس سے ذوق کو خاطر خواہ طور پر تسکین حاصل نہیں ہوتی، مضامین کی ترتیب و نسق اور معانی کا ضابطہ بجائے خود سب سے بڑا اور اہم کام تھا، جس میں مؤلف صحیفہ ادب نے پوری کامیابی حاصل کر لی ہے،

توضیح مطالب میں مثالیہ اشعار بھی نہایت موزونیت سے چپاں ہوئے ہیں، انگریزی نظمیں کے تراجم بھی نہایت چست اور زوردار طبع ہوئے ہیں، الغرض کتاب کو ایک نظر دیکھ لینے سے بھی مصنف حسن انداز

اور روانی طبع کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے، میں یقین کرتا ہوں کہ ایسی
نمایاں اور ممتاز چیز کی اتنی ہی قدر افواہی کی جائیگی، جتنی کہ اُس کے لئے
سزاوار ہے۔“

از حضرت مولانا صغریٰ صاحبہ وحی سابقہ پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور

”میں نے صحیفہ ادب مؤلفہ منشی عبدالرحمن صاحب کا مطالعہ کیا
اس میں شعر کی تحقیق ایک نئے پیرایہ میں قلبند کی گئی ہے، جس کا ہمیں
فراخ حوصلگی کے ساتھ خیر مقدم بجالانا ضروری ہے، لائق مؤلف
نے جو کچھ لکھا ہے، اردو زبان کے دلدادگان کے لئے زبان اردو میں ایک
بہترین اضافہ ہے، میرے خیال میں یہ کتاب اس قابل ہے کہ پنجاب
یونیورسٹی کے صیغہ امتحانات اردو میں اس کو بطور نصاب
لے لیا جاوے۔“

دیباچہ

از

مُبَصِّر فنِ حضرت مولانا سید ولاد حسین صاحبِ نشاۃِ انِ ملگرامی
پروفیسر آف اورینٹل کالج لاہور

اہل پنجاب میں یہ خاص خوبی ہے، کہ بیکار نہیں بیٹھتے، کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہتے ہیں، یہ فطرت اُن کی عام ہے، کہ مخفی واقع ہوئے ہیں، خصوصاً اردو کے ساتھ تو ان کو وہ شغف ہے، کہ قابلِ بیان نہیں، روزانہ نئی نئی کتابیں جدت سے بھر رہی شائع ہوتی رہتی ہیں، کونسا ایسا علم، فن، صنعت و حرفت ہے، کہ اس میں اچھی یا بُری تصنیف پنجاب سے شائع آئے دن نہ ہوتی رہتی ہو، حیدر آباد کو چھوڑ کے تمام ہندوستان کے تصانیف ایک طرف اور پنجاب کے ایک طرف پنجابویں نے اردو کو وہ کام کیا، کہ اہل زبان سے نہ ہو سکا۔ زبانِ اردو ان کی ہمیشہ ممنونِ احسان رہے گی، حیدر آباد اور پنجاب کی وجہ سے اردو کا شہر اگر

(ب)

کلاسکل لینگویج میں نہ کیا جائے۔ تو ادسپر ظلم ہے، جو لوگ یورپین زبانوں کی تصانیف کے تراجم کے لئے اسے ناکافی سمجھتے ہیں، وہ خود اردو زبان پر قدرت نہیں رکھتے ہیں، ورنہ اس میں اس قدر سرمایہ موجود ہے، کہ کسی جگہ یہ عاجز و مجبور نہیں، جن کو زبان اردو پر قدرت حاصل تھی، انہوں نے یورپین تصانیف کے تراجم کر کے اس کی سرمایگی کو ثابت کر دیا، حکومت انگریزی سے پہلے شاہان ہندوستان ایرانی تھے، اس لئے انہوں نے دفتری زبان فارسی رکھی، اور اردو کی تربیت کی طرف ان کی توجہ نہ ہوئی، اور مصطلحات علوم و فنون مصنفین اپنی تصانیف میں عربی و فارسی سے مستعار لیتے رہے۔ لیکن حضور نظام خداداد اللہ ملکہ نے اس کی کو باجن وجوہ پورا کر دیا، اور کسی قسم کی کمی اب نہیں رہی، بنا بر قول مشہور اردو کی عہد طفولیت میں شاہجہان نے پرورش کی، مگر علم سے مالا مال علیحضرت میر عثمان علی خاں صاحب بہادر بالقاء نے کر دیا۔

شیخ عبدالرحمن صاحب طارق اسی تبار مغز صوبہ کے ایک ہونہار فرد ہیں، جنہوں نے منشی فاضل اڈریٹیل کالج لاہور سے پاس کیا، اور اب میٹرک کے بعد ایف اے بھی پاس کر چکے ہیں، اردو لٹریچر میں انکا مطالعہ زائد الوصف ہے، اگر یہ دعویٰ ہماری اہل زبان کریں۔ تو بیجا نہ ہو گا، حال میں انہوں نے ایک دُرُ التالیف کی بنیاد ڈالی ہے۔ اسی ادارہ سے ان کی پہلی تصنیف صحیفہ ادب کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ جس میں شعر و شہادہ سے فلسفیانہ

اور دلچسپ بحث کرتے ہوئے کلام غالب اعلیٰ اللہ مقامہ کے وہ وہ نکات بیان کئے ہیں، جن کی طرف ان سے پیشتر کے شاعرین کی توجہ نہ ہوئی شرح دیوان غالب لکھنا ان کا مقصد نہیں، بلکہ غالب کے فلسفیانہ خیالات کا اظہار مطلوب ہے، اور ان کی شاعری کی امتیازی حیثیت کو ہلکے سانسے میں کرنا، اور انتقادِ صحیح سے کام لینا۔ اس کتاب کے بابِ اول میں مطلق شعر و شاعری سے حکیمانہ بحث کی ہے، اور اپنے دعاوی کو شواہد و اسناد سے مستحکم بنایا ہے، دوسرے باب میں خاص مرزا کی شاعری ان کے نچلے کی بلندی ان کی خوبی ادا، اور خیالات فلسفیانہ کا ذکر آسان اور زود فہم عبارت میں کیا ہے، صنائعِ پدائے کا بھی ذکر کرتے ہیں، جو شاعری میں صرف کئے جاتے ہیں، حکماء و شعرا دیورپ کے اقوال و اشعار کے تراجم نہایت خوبی سے کئے ہیں، غرضیکہ اپنے ادعا کو مستدل بنانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے، غالب کے دیوان کے پہلے شعر کا ذکر بطور مثال کرتا ہوں، کہ دوسرے شاعرین کیا کہتے ہیں، اور یہ اس میں کس نزاکت کو دیکھتے ہیں،

نقشِ فریادی ہے کسکی شوخی تحریر کا کاغذی ہے پرین ہر پیکر تصویر کا
خود غالب مرحوم اس مطلع کے معانی یوں لکھتے ہیں،

”ایران میں رسم ہے، کہ دادخواہ کاغذ کے کپڑے پہن کر حاکم کے سامنے جاتا ہے، جیسے مشعلِ دن کو جلانا یا خونِ آلود کپڑا بانس پر لٹکا کے لے جانا جس شاعر خیال کرتا ہے، کہ نقش کس کی شوخی تحریر کا فریادی ہے کہ چھوڑ دیتا تصویر“

ہے، اس کا پیر من کا غدی ہے، یعنی ہستی اگرچہ مثل ہستی تصویر اعتبار محض ہو
 موجب رنج و ملال ہزار ہے، غرض مصنف کی یہ ہے کہ ہستی میں مبدعہ حقیقی
 سے غیرت و جلفی ہو جاتی ہے، اور اس معشوق کی مفارقت ایسی شاق ہے،
 کہ نقش تصویر تک اس کا فریادی ہے، اور پھر تصویر کی ہستی کوئی ہستی نہیں
 مگر نفا فی اللہ ہونے کی رو سے بھی آرزو ہے، کہ اپنی ہستی سے نالاں ہے۔
 ایک بزرگ مرحوم غالب کے بتائے ہوئے معنوں پر اپنی رائے کا اس طرح
 اظہار فرماتے ہیں :-

”اس شعر میں جب تک کوئی لفظ ایسا نہ ہو جس سے نفا فی اللہ ہونیکا شوق اور
 ہستی اعتباری سے نفرت ظاہر ہو، اُس وقت تک اسے با معنی نہیں کہہ
 سکتے، کوئی جان بوجھ کر تو بے معنی کہتا نہیں، وزن اور قافیہ کی تنگی سے بعض بعض
 ضروری لفظوں کی گنجائش نہ ہوتی، اور شاعر سمجھا کہ مطلب ادا ہو گیا، اس شعر
 میں مصنف کی غرض یہ تھی، کہ نقش تصویر ہستی بے اعتبار دے تو قیر کا فریادی
 یہی سبب ہے کاغذیں پیر من ہونے کا، لفظ ہستی بے اعتبار کی گنجائش نہ ہوتی۔ اس
 سبب سے کہ قافیہ مزاحم تھا، اور مقصود تھا، مطلع کہتا، ہستی کے بدلے شوخی تحریر
 کہہ دیا، اور اس سے کوئی قرینہ ہستی کے حذف پر پیدا نہ ہوا، آخر خود ان کے منہ
 پر لوگوں نے کہ دیا، کہ شعر بے معنی ہے۔“

لیکن طائر کی نظر دور بین اور حقیقت شناس ذیل کی باریکی اور نکتہ
 کو اس میں دیکھتی ہے کہ :-

جس طرح ایک تصویر اپنے مصور کے کمال کو ظاہر کرتی ہے، اسی طرح دنیا کی ہر

چھوٹی بڑی چیز بھی اپنے صالح حقیقی کے کمال صنعت پر زبان حال داد دے رہی ہے، لیکن قاعدہ ہے، کہ جب ایک چیز پیدائی جائے تو اس پر تنقید بھی ہوتی ہے، پس اس چیز کا فریاد کرنا اس وجہ سے ہوا، کہ اگر مجھے پیدا کیا تھا، تو دیکھنے والوں کو بھی ایک ایسی نظر عطا کی ہوتی، جس سے دُہ میرے اسرار و رموز کو کما حقہ سمجھ سکتے، گویا شانوار انداز میں ایک شکایت آمیز حمد و ثناء ہے ۝

اسی طرح کتاب کا ہر صفحہ لطائف ادبیہ سے مالا مال ہے، عبادین جتنے اختیار کئے ہیں، وہ ماہیت شعر پر روشنی ڈالنے کے لئے سب کے سب اہم اور ضروری ہیں، تفسیریں اشعار بر محل نے مباحث کو اور بھی دلچسپ بنا دیا ہے ۝

اس سلسلہ تالیف کی دوسری کتاب فردوس معانی بھی تیار ہے، جس میں ہند کے ممتاز دوسرے برآوردہ شعراء کا ذکر ہے، اور ان کے روحانی اور اخلاقی کلام پر تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے، عنقریب شائع ہو کر اپنی دلفریبیوں سے ناظرین کو اپنا شیفہ اور فرقیہ بنائے گی، یقیناً ان کی تصانیف اپنی جامعیت اور خوبی انداز کی رُو سے قبولیت عامہ کا سہرا اپنے سر باندھیں گی ۝

شادان بلگرامی

۱۶ مارچ ۱۹۳۵ء

عرصہ حال

آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا
آسمان اڈو بے ہوش تاروں کا ماتم کب تک

برادران وطن! آج ہندوستان میں اردو زبان کے خلاف
آئے دن جس شد و مد کے ساتھ صدائے احتجاج بلند کی جاتی
ہے۔ وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، نہ صرف یہی۔ بلکہ جو لوگ اس
فتنے کو، جس کی بنا سرسربہالت اور کورڈوٹی پر ہے، فرد کر دینے کی
طاقت اور قابلیت رکھتے ہیں۔ انہیں بھی اس فرض کا ذرا احساس
نہیں، اور باوجود اس غفلت اور سستی کے وہ خوب اچھی طرح سے
جائے ہوئے ہیں۔ کہ :

گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے
شمع یہ سودانی ولسوزی پروا نہ ہے

خدا جانتا ہے کہ اس بحث میں مجھے کسی فرد یا جماعت کی
تخصیص ہرگز منظور نہیں ہے۔ اور اس لئے میں صاف الفاظ
میں جتلا دینا چاہتا ہوں۔ کہ :-

دعے سخن کسی کی طرف ہو تو رویہ سودا نہیں جنوں نہیں حشت نہیں مجھے

لیکن ہاں جب مخفیین کی مسلسل اور پیہم کوششوں کو دیکھتا ہوں۔ اور ادھر مسلمانوں کے جمود اور بے حتی پر بھی نظر پڑتی ہے۔ تو اس وقت رنج اور استعجاب سے میری حالت کچھ دیوانوں کی سی حالت ہو جاتی ہے، نوجوان طبقہ سے بھی مجھے یار مار گفتگو اور ملاقات کا اتفاق ہوا۔ لیکن صدیغ کہ انہیں بھی سوائے یورپ کی اندھا دھند تقلید کے کسی قومی یا ملی فرض کا احساس تک نہیں: زیادہ سے زیادہ انکی زندگی کا جو شاندار پروگرام ”مجھے معلوم ہو سکا“ وہ اکبر مرحوم کے الفاظ میں حسب ذیل ہے —

ہم کیا کہیں احباب کیا کار نمایاں کر گئے
بی اے ہوئے نوکر ہوئے نیشن ملی پھر مر گئے
یاد رہے کہ جو قوم صرف ظاہری آرائش ہی پر جان دینے لگتی ہے، اقتصادی زوال کے ساتھ ہی ساتھ اس کے علمی اور ادبی قوی بھی خود بخود مضحل ہو جایا کرتے ہیں؛ دیکھنے میں آیا ہے کہ یونیورسٹیوں کے بڑے بڑے سند یافتہ بھی زبان کا صحیح استعمال نہیں جانتے ہیں، قواعد کا جانا تو بڑی چیز ہے، الفاظ کی تذکیر و تانیث تک کا انہیں علم نہیں،

گر ہمیں مکتب است و ہمیں ملا کا طفلان تمام خواہ شد
یہ سب کچھ اپنی ملکی اور مادری زبان سے غفلت برتنے کی وجہ سے ہے، وہ اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ قوموں کی زندگی میں ان کے

لڑ پھر کی ترویج و اشاعت کو بھی ایک بڑا دخل ہے، جب تک کسی قوم میں یہ ذوق و شوق باقی رہتا ہے۔ دنیا میں اس کے زور و اثر کو بھی تسلیم کیا جاتا ہے، لیکن جوہنی یہ سپرٹ فوت، اور یہ جذبہ مفقود ہوا تو ساتھ ساتھ ہی سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ قوم بھی ہمیشہ کیلئے موت کے آغوش میں ہو گئی، لیکن کیجئے کیا کہ مغرب کے دیوانے اس وقت مشرق کو خاطر میں بھی نہیں لاتے ہیں، اور پھر لطف یہ کہ :-

فخریہ میں نے جو اشعار پڑھے سدی کے فخریہ وہ بھی سنانے لگے نظم ملٹن
شیخ سعدی تو بزرگوں میں مرتجی است آپکے کون تھے ملٹن میں سنن حضرت؟

اس سے یہ ہرگز نہیں سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ میرے نزدیک کسی دوسری زبان کی ادبیات سے مستفید ہونا ہی سرے سے ناجائز ہے۔ ورنہ یہ تو نقصان اور محرومی کا باعث ہوگا، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ارشاد ہے: **كَلِمَةُ الْحِكْمَةِ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ حَيْثُ وَجَدَهَا فَهُوَ أَحَقُّ بِهَا** ... ترجمہ اس کا یہ ہے :

کہ حکمت کو اک گمشدہ لال سمجھو جہاں پاؤ اپنا اسے مال سمجھو
اقتساب ہنر کے لئے اس سے زیادہ وسیع اجازت اور کیا ہو سکتی ہے۔ اور اوصاف کا نمونہ اس سے بڑھ کر آج کون پیش کر سکتا ہے؟ — تنگ ظرفی کا تو اسلام کسی حالت میں بھی قائل نہیں، اس کا عقیدہ ہمیشہ سے وہی عقیدہ چلا آتا ہے، جس کا اظہار نظیری نے اپنے شعر میں کیا :

گر پیر سالکی خبر از طفل راہ پرس لے شرم از طلب مدار کہ زنا عالم است
 باقی رہا یہ سوال کہ اس جگہ "حکمت" سے ہماری مراد کیا ہے، تو
 اس کی توضیح کے لئے ہم قرآن مجید سے استشاد کرتے ہیں، چنانچہ
 ایک مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ
 اِذَا اشْكُرَّ لِلّٰهِ وَمِنْ يَشْكُرْ فَاَتَمَّا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ
 غَفِيْرٌ حَمِيْدٌ یعنی: "ہم نے لقمان کو حکمت سے مشرف کیا تاکہ وہ
 ہماری اس جہر بانی کا شکریہ بجالائے، اور جو کوئی بھی ہمارا شکر بجالاتا
 ہے تو اس میں وہ اپنی ہی ذات کے لئے بہتری اور فائدہ پاتا ہے،
 اور جو ناقدری کرتا ہے تو اس کا وبال بھی اس کی اپنی ہی جان پر
 ہے، اور ہم تو اعمال کے بارے میں اپنے بندوں کی نسبت ہر طرح
 سے بے نیاز ہیں۔" پھر ایک دوسرے مقام پر فرمایا یُؤْتِ الْحِكْمَةَ
 مَنْ يَّشَاءُ وَمَنْ يُؤْتِ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا وَمَا يَذْكُرُوْ
 الْاَوَّلٰی اِلَّا الْبَآبُ ہم جسے چاہتے ہیں حکمت عطا کرتے ہیں اور
 جس شخص کو یہ نعمت عظمیٰ تفویض کر دی گئی، اُس نے گویا خیر کثیر کو
 پایا، اور نصیحت تو فقط عقلمند لوگ ہی پکڑتے ہیں۔ اب لفظ
 "حکمت" اپنے اندر کیا مفہوم رکھتا ہے، "خیر کثیر" کس کو کہتے ہیں
 اور پھر "عقلمند" لوگوں کی صفات کیا ہیں؟ — ان تمام چیزوں

لہ آیت کریمہ: فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّکْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ — جب تمہیں
 کسی شے کی نسبت واقفیت نہ ہو تو اباب علم سے دریافت کر لیا کرو۔

کی تشریح ایک دوسرے مقام پر اس طرح سے کی: اِنَّ فِيْ
 خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاٰخِلَافِ الْبَلِّ وَالتَّهَارِ لَاٰيٰتٍ
 لِّاُولِيْ الْاَلْبَابِ: اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَتَعُوْذًا وَّعَلٰى
 جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا
 خَلَقْتَ هٰذَا اَبَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ:- ”آسمان و
 زمین کی پیداوار، اور رات و دن کے اس (منظم) اختلاف میں عقل مند
 لوگوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں، وہ عقل مند لوگ جو خدا کو
 اُٹھتے، بیٹھتے، لیٹتے، غرضیکہ ہر وقت اور ہر حالت میں یاد کرتے
 ہیں، اور ساتھ ہی کائناتِ عالم کی ہر چھوٹی بڑی چیز کا غور سے
 مطالعہ کرتے ہیں، (اس کی حیات اور مقصد حیات کو پورے تدبیر
 سے دریافت کرتے ہیں) اور نتیجہ کار ایک شاہدِ عادل کی حیثیت
 میں بے اختیار پکار اُٹھتے ہیں کہ الہی! تو نے یہ کارخانہ بے کار
 اور لایعنی پیدا نہیں کیا ہے، تیری خدائی ہر قسم کی شرکت سے پاک
 ہے، پس ہمیں بھی عذابِ دوزخ سے بچالے۔“

اب تو غالباً آپ حکمت کے اس مفہوم کو بخوبی سمجھ گئے ہوں گے
 جسے کہ ابتداء ایک ”گمشدہ لال“ سے تعمیر کرتے ہوئے اسکی تحصیل
 ہر مومن کے لئے ضروری قرار دی گئی تھی، اور اگر اب بھی آپ کوئی
 چیز سمجھ نہ سکے ہوں، تو اس تمام بحث کا خلاصہ حیات کی ایک
 رباعی میں ملاحظہ فرمائیے، وہ کہتا ہے:-

گزارے شہوت و ہوا خواہی رفت از من خبرے کہ بے نوا خواہی رفت
 بنگر چہ کسی وار کج آ مدہ می داں کہ چہ می کنی کجا خواہی رفت
 یعنی: ”اگر تو نے اپنی زندگی محض ہوا و ہوس ہی میں برباد کر دی
 تو یاد رکھ کہ موت کے وقت تجھ جیسا محروم انسان اور کوئی نہیں ہوگا
 اب (کہ صحت بھی ہے اور فرصت بھی) تجھے غور کرنا چاہیے کہ تو کیا
 ہے، کہاں سے آیا ہے، کیا کر رہا ہے، اور بالآخر کہاں جائیگا۔“
 تو نتیجہ کار ہمیں یہ معلوم ہوا کہ ”حکمت“ کا بڑا مقصد انسان کو
 ”معرفت نفس“ کا سبق دینا ہے، جس سے کہ حسب ارشاد خداوندی
 لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ: ”ہم نے انسان کو
 بہترین صورت میں پیدا کیا“، وہ اپنے ثروت و فضل کا ٹھیک ٹھیک
 اندازہ کر سکے، اور یہ بھی بجائے خود ایک ایسا فائدہ ہے، جس کی نسبت
 آنحضرتؐ نہایت بلیغانہ انداز میں فرما چکے ہیں کہ مَا هَٰذِهِ أُمُورٌ
 عَرَفْتَ قَدْرَکَ یعنی ”جس شخص نے اپنی عظمت اور بزرگی کو پہچان
 لیا وہ کبھی برباد نہیں ہوگا“ اور اقبال نے تو گویا بالکل اسی مقصد
 کے پیش نظر ایک جگہ کہا ہے اور کیا خوب کہا ہے کہ :-

زمن گو صوفیان با صفارا خدا جویان معنی آشنا را
 غلام ہمت آں خود پرستم کہ بانور خودی بیند خدا را
 اور پھر ختم کی ایک اور رباعی کو بھی ہم اسی بیان کی ایک
 نہایت عمدہ اور جامع تصدیق پاتے ہیں، چنانچہ :-

روزے کہ جنائے ہر صفت خواہد بود قدر تو بقدر معرفت خواہد بود
 در صفت کوش کہ در روزِ جوا شر تو بصورت صفت خواہد بود
 ”جس روز کہ اعمال کا بدلہ دیا جائیگا، تیری عزت افزائی بھی اسی قدر
 ہوگی، جس قدر کہ تو معرفت رکھتا ہے، پس تجھے چاہیئے کہ اعمال صالحہ
 میں انتہائی کوشش سے کام لے، تاکہ اس دن تیری بُرائیاں بھی نیکوں
 سے بدل جائیں۔“

کیا میرے نوجوان بھائیوں کو اب بھی شرم نہیں آئے گی کہ ایسے
 پاکیزہ اور برتر مقصد کے لئے ان کے بزرگوں کے لکھے ہوئے بھٹنے
 مفید اور عمدہ ذخائر ہو سکتے ہیں، وہ تو سب کے سب یورپ کے
 کتب خانوں میں محفوظ ہوں، وہ ان سے روشنی اخذ کریں، اور یہ اپنی
 محکومانہ ذہنیت کو لئے ہوئے اسی طرح خواب غفلت میں سوئے
 رہیں، واغنی کشمیری! کہ تیرا ارشاد بھی ہمارے لئے عبرت کا
 فسانہ ہے۔

غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن
 کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخارا
 اس کے بعد جب داغطان قوم کی حالت کا معائنہ کیجئے تو وہ او
 بھی زیادہ یاس انگیز ہے، کسی ادنیٰ یا لسانی ذوق کا تو کیا ذکر، ان کے
 نزدیک چند رسمی خطبات ہی کو منبر پر کھڑے ہو کر طوطے کی طرح رٹ
 دینا زندگی کا انتہائی کمال ہے، علوم اسلامیہ کی سطر سطر اور لفظ لفظ

ویکھ ڈالا، لیکن نہ تو تقریر میں دو جملے صحیح طور پر بول سکتے ہیں، اور نہ تحریر میں اپنے مافی الضمیر کے اظہار پر قادر ہیں، اور باوجود ان تمام کوتاہیوں کے شکاکت بھی ہے، کہ ملک کا تعلیمیافتہ طبقہ ہمیں نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے، سو بھائی! آپ کے حق میں تو علامہ اقبال نے بجا ارشاد فرمایا ہے، اور وہ اس طرح کہ :-

واعظ قوم کی وہ سچتہ خیالی نہ رہی برق طبعی نہ رہی شعلہ مقالی نہ رہی
رنگی رسم ازاں رُوح بلالی نہ رہی فلسفہ رنگیاں تلقین غوالی نہ رہی
مسجیدیں نوحہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے

یعنی وہ صاحب اوصاف حجازی نہ رہے

باقی رہی آپ کی دینی حیثیت اور مذہبی رواداری، تو اسکی نسبت بھی ”جاوید نامہ“ میں سعید حلیم پاشا کی زبانی واقعات اور حقائق کا اظہار ان الفاظ میں کیا جا چکا ہے :-

دین حق از کافرے رسوا تر است زانکہ ملا مومن کافر گر است
زاں سوئے گردل و لاش بیگانہ نزد او اُمّ الکتاب افانہ
بے نصیب از حکمت دین نبی آسمانش تیرہ از بے کوہی
از شکر قہائے آں قرآن فروشن دیدہ ام رُوح الامیں وادخروشن
کم نگاہ و کور ذوق دہر زہ گرد ملت از قال و اقوالش فرو فرد

دین کافر شکرت تدبیر جہاد

دین ملا فی سبیل اللہ فاد

پھر کیا آپ خیال فرما سکتے ہیں، کہ موجودہ جرائد و صحائف کے ایڈیٹر بھی ادب یا زبان کی کوئی مستقل خدمت سرانجام دے رہے ہیں، کیا وہ سب کے سب فن سے باخبر ہونے کے علاوہ اسکی ترقی اور فروغ کے لئے اپنے دلوں میں کوئی صحیح احساس رکھتے ہیں، کیا وہ اس ذوق و وجدان سے بہرہ ور ہیں، جو ایسی برگزیدہ خدمت کے سرانجام دینے کے لئے سب سے پہلی اور سب سے زیادہ ضروری چیز ہے، اور کیا ان کا فروغ روحانی یا ان کی بصیرت اس بارے میں اتنی ہی قوی ہے جتنی کہ ہونی چاہیئے؟ — یقیناً جواب نفی ہی میں دینا پڑیگا، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں سے اکثر کا مقصود محض پیسے بٹورنا اور ایڈیٹروں کی صف میں اپنا نام درج کر لینا ہے اور بس، جہاں دکاتداری ہو وہاں ہمدردی کبھی نہیں آسکتی!، ... کیا یہ ہمدردی کا ثبوت ہے کہ رومی کا غدا اور بدنما لکھائی کے ساتھ چند غلط سلط چیزیں سپلک کے سامنے پیش کر دی جائیں، ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ میں نے اقبال کی شاعری پر ایک طویل مقالہ سپرد قلم کیا، اور جیسا کہ مطالبہ تھا، ایک ایڈیٹر صاحب کے یہاں بھجوا دیا، اس میں شک نہیں کہ رسالہ کثیر الاشاعت ہے، اور ادبی حلقوں میں اچھا تعارف بھی لکھا ہے، لیکن جب مضمون چھپا تو علاوہ دیگر تصرفات کے، جو بالعموم کاتبوں کے شرمندہ احسان ہوا کرتے ہیں، ایک یہ بھی تھا، کہ جہاں مضرت خودی

چرعلامہ موصوف کا یہ شعر :-

تا تو انی کیمب شو گل مشو
درجہاں شغم شود سائل مشو

— نقل کرتے ہوئے میں نے اس کی تائید و تصدیق میں ایک حدیث شریف پیش کی، وہاں کاتب نے ایک ایسی افسوسناک (یا مضحکہ خیز) غلطی کا ارتکاب کیا، جو ان لوگوں کا ہمیشہ سے طرہٴ افتخار چلا آتا ہے، یعنی اَلَيْدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِنْ يَدِ السُّفْلَى کی جگہ اللہُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِنَ اللہِ السُّفْلَى لکھ دیا، تو معلوم ہوا کہ اگرچہ میں تو چشمِ زون میں خداؤں کا بھی ایک ڈھیر لگ سکتا ہے، ایڈیٹر صاحب کو توجہ دلائی، اور تصحیح کے لئے التجا کی، لیکن وہ حضرت کچھ ایسے ”مستقل مزاج“ واقع ہوئے تھے کہ لٹس سے مس نہ ہوئے، اظہار فرماتے تو اس سے اپنی قابلیت کو بٹا لگتا تھا؛ خیر بات آئی گئی ہوئی اور ہم بھی ”قہر و رویش بر جان درویش“ پر اکتفا کرتے ہوئے کسی دوسرے موقع کے لئے خاموش ہو رہے؛ پھر ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ کسی مسلم اخبار کے ایڈیٹر ”صاحب سے دو چار ہونے کی ضرورت پیش آئی، خبر تھی کہ فلاں جگہ سیلاب سے گاؤں کے گاؤں تباہ ہو گئے، باشندوں کی حالت بہت خراب ہے، اور اس ضمن میں قارئین سے استدعا ہے کہ وہ ان ”مظلوموں“ کیلئے دعا کریں، میں نے انہیں بتلایا کہ اس لفظ کی تصحیح ہونی چاہیئے، خدا فرماتا ہے کہ اِنَّ اللہَ

لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ اور پھر وَمَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ اور پھر اس سے بھی زیادہ مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللَّهِ وَمَا أَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِكَ — تو ان تمام شواہد کے ہوتے ظلم کی نسبت خدا کی طرف کرنا کسی لحاظ سے بھی ٹھیک نہیں، حضرت اس پر بگڑے اور لگے اصرار کرنے کہ نہیں صاحب لفظ جس حیثیت میں مستعمل ہوا ہے وہ بالکل ٹھیک ہے، اور تصحیح کی چنداں گنجائش نہیں، اسپر ان کی جو خبر لی گئی اور جتنا کچھ انہیں اس بیجا سیدہ زوری پر نادم ہونا پڑا، اسے آج تک یاد فرماتے ہونگے، پھر ایک اور ادبی رسالہ کہ اُس کی بھی کافی شہرت ہے، میر کی شاعری پر ایک مضمون شائع کرنا ہے، اور اس میں صریحاً خط عارض کو نامہ محبوب سے تعبیر کرتا ہے، اور ایسی فحش اور اظہر من الشمس غلطی پر اسے ذرا بھی احساس نہیں ہوتا، شعر یہ تھا:۔

حُسن تھا تیرا بہت عالم فریب
خط کے آنے پر بھی اک عالم رہا

اسی طرح ایک اور ماہوار مجلہ ”استفادہ کرنا“ کی بجائے ”استفادہ حاصل کرنا“ لکھا ہے، اور یہ بھی بجائے خود ایک ایسی فروگزاشت ہے، جو ایک جگہ نہیں، بلکہ متعدد مقامات پر دیکھنے میں آئی، اب ایڈیٹر کی عینک اسے دیکھ سکے یا نہ دیکھ سکے، لیکن آنکھوں والے تو ضرور دیکھ لیتے ہیں، پھر ایک جگہ لکھا ہے ”کلیم دیر تک استغفار مانگتا رہا“ یہاں بھی اگر گستاخی معاف ہو تو میں عرض کر دوں گا کہ محاورہ

حقیقت میں "استغفار مانگنا" نہیں بلکہ "استغفار کرنا" ہے، سند میں ذوق کا ایک شعر لیجئے :-

مری طاعت سے اب تو محصیت بھی عار کرتی ہے
مری توبہ پہ توبہ، توبہ استغفار کرتی ہے

یہ مشقہ نمونہ از خردارے تو محض ناظرین کی اطلاع کے لئے پیش کیا جا رہا ہے، ورنہ تفصیل کی جائے تو پھر قیامت ہی آئے، خدا جانے یہ لوگ ایک میز کرسی حاصل کر لینے پر کہاں کہاں کے خواب دیکھنے لگتے ہیں، بہر کیف یہ حالت اندھوں میں کانے راجہ بن بیٹھنے والی بات ہے، جس کی اصلاح بھی انہیں کی توجہ اور کوشش پر موقوف ہے،

پھر بعض سست بنیاد اور بے خبر لوگ آپکو ایسے بھی طینکے جو کہتے ہیں کہ صائب کیا کیا جائے اُردو زبان کا سرمایہ کچھ ایسا محدود واقع ہوا ہے کہ اس میں بیان کا حق ادا نہیں کیا جاسکتا "تو اس کی جگہ دہ یہ کیوں ارشاد نہیں فرماتے کہ "ہم پر کچھ ایسی مرگ خاموشی، اور ایسا جمود و سکون طاری ہو رہا ہے کہ دہ ہمارے دل میں فرض کا صحیح احساس پیدا ہونے نہیں دیتا اس لئے ہمیں معذور رکھا جائے" سچ تو یہ ہے کہ ان صاحبان پر ناچ نہ جائے آنگن ٹیڑھا دلی مثل صادق آتی ہے، — نہ طبیعت میں ہوز و نیت ہے اور نہ نظر میں وسعت، اور بایں ہمہ بات اس وثوق سے کہتے ہیں، کہ گویا

لے مستثنیات ہر چیز میں ٹھوکر تھپتی ہیں، اور بہت ممکن ہے کہ یہاں بھی ہوں، میں نے اس بیان میں ہر جگہ اکثریت کو لحاظ رکھتے ہوئے بحث کی ہے ۱۲

اس میں کسی تغلیط یا شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں، سو اگر وہ سبکدوش نہ ہو تو دنیا کی ہوا کھائیں اور محض کوئیں کے مینڈک بن جائے ہی پر اکتفا نہ کریں، تو انہیں بہت جلد معلوم ہو جائیگا، کہ وہ کس چہل مرکب میں مبتلا ہیں، اے حضرت! جہاں رزمیہ کلام میں انیس جیسے مسلم الثبوت اُستاد موجود ہوں، جہاں عشق کی محفل آرائی میں تیز مومن اور داغ لے فصاحت کے دریا بہا دیئے ہوں، جہاں فلسفہ اور نفسیات میں غالب جیسی ہستی موجود ہو، جہاں تصوف اور معرفت میں میر درد جیسے بزرگ تشریف فرما ہوں، جہاں اخلاقیات میں حالی اور اکبر لے بھی کوئی کمی باقی نہ رکھی ہو، جہاں شوخی اور بذلہ سنجی میں انشاء اور زنگین لے دفتر کے دفتر سیاہ کر ڈالے ہوں، اور پھر جس زبان میں اقبال جیسی ہنگامہ خیز اور پھل پیدا کر دینے والی شاعری بھی کار فرما ہو، وہاں الفاظ اور محاورات کی بھلا کیا کمی ہو سکتی ہے، ضرورت صرف شوق کی ہے، اور پھر شوق کے ساتھ ہی ساتھ اس قابلیت کی ہے، کہ جس سے چیزوں کو اپنے ذہن کے اندر محفوظ رکھتے ہوئے ان کے صحیح اور بریل استعمال کا پتہ چلا یا جاتا ہے، ان کی سند میں جستجو اور کوشش سے کام لیا جاتا ہے، انکو مناسب طور پر تطابق دیا جاتا ہے، جس سے نہ صرف موازنہ و تنقید ہی کا باب کھلے، بلکہ مضامین میں جدت کا رنگ بھی نمایاں ہو — اور پھر ان تمام باتوں کو دُھ محنت درکار ہے، کہ جس پر داغ لے ایک دفعہ کہا تھا :-
 نہیں کھیں لے داغ یاروں سے کہہ دو کہ اتنی ہے اُردو زبان آتے آتے
 پھر علاوہ ان تمام خوبیوں کے جو اُردو کو اس وقت حاصل ہیں، معاشرتی

نقطہ نظر سے بھی دیکھئے، تو یہ زبان تعصب اور عناد کی جگہ محبت اور اتحاد کی داعی ہے، لیکن مجھے نہایت افسوس سے اظہار کرنا پڑتا ہے کہ بعض ہمسایہ قومیں جو بے خبری کے عالم میں اپنی زبان کی حمايت کرتے ہوئے اردو کو اس کا مد مقابل ٹھہراتی، اور اسے ایک سوکن کی حیثیت دیکر جسکا اثر شروع کر دیتی ہیں یہ سراسر حقیقت سے ناواقف ہونے کا نتیجہ ہے، میرے مکرّم بھائیو! جو زبان استفادہ فرائدل اور فرخندہ رُودِ واقع ہوئی ہو، کہ ہندی آئے تو اُس کو گلے لگالے، فارسی آئے تو اُسے اپنی آغوش میں جگہ دے، عربی آئے تو اس کی آؤ جگت میں کوئی کئی باقی نہ رکھے، اور پھر انگریزی آئے تو اسے بھی اپنی سر آں لکھوں پر جگہ دے، وہ کسی اختلاف یا منافرت کا باعث کیونکر ہو سکتی ہے یہی وجہ ہے کہ آج اس کی شہرت اور مقبولیت ایک عالمگیر حیثیت اختیار کر چکی ہے، کہیں بھی اس کے بغیر چارہ نہیں، اس کی فطری لطافت اور پیدائشی مؤزوبیت تمام دلوں میں یکساں طور پر اپنا گھر کئے ہوئے ہے، ہر معقول پسند انسان اسے ہندوستان کی مشترکہ زبان (Lingua Franca) تسلیم کر لینے میں ذرا بھی تامل نہیں کرتا، اب بھی اگر کوئی اس نگار سے اُلفت نہ کرے تو بڑا ہی مُردہ دل اور انتہا درجے کا بد نصیب ہے!

پھر اکثر مصنفین کا قاعدہ چلا آتا ہے، کہ وہ اپنے مباحث میں غیر ضروری طور پر ایک دُکھار اور فرقہ دارانہ مسلک اختیار کر لیتے ہیں، یعنی ایک موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ان فوائد کو جو انواع انسانی کیلئے مشترکہ حیثیت رکھتے ہیں، محذوٰد اور مُقید بنانے کی کوشش کی جاتی ہے، یکسی لحاظ

سے بھی قابلِ تفریق چیز نہیں، فطرت نے سب کو یکساں طور پر بہرہ ور ہونے کا موقع دیا ہے، لہذا کسی شخص کو بھی یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس میں ذاتی طور پر کسی قسم کا تصرف کرے، اور اگر کرے، تو اس کی یہ خصلت تلافی اور اخلاقی وجہ کی بنا پر بھی اسی تک محدود و تصویب کی جائے گی، اسلام کی سیزوہ صد سالہ روایات محبت اور یگانگت کیلئے تو ایسی نظیریں بکثرت پیش کر سکتی ہیں، جن میں ایک شخص کے قول کو ساری قوم کی ذمہ داری تسلیم کر لیا گیا ہو، لیکن ایسا واقعہ کوئی بھی نہیں ملیگا، جس میں کہ شر اور زیادتی کی خاطر کسی کی بات معتبر سمجھ لی گئی ہو؛ یہاں تو خلاف مصلحت بات کے لئے خلیفہ عمر رضی اللہ عنہ جلیل القدر ہستی کے سامنے بھی شمشیر برہنہ کر لی جاتی ہے، پھر کسی دوسرے کیلئے بھلا کیا وقعت ہو سکتی ہے؛ پس جہاں ایک شخص کچھ لکھنے کا ارادہ کرے وہاں احتیاط اور سلیقہ اس کو مجبور کرتا ہے، کہ وہ ایک عالمگیر صداقت کو شخصی جذبات سے ہرگز مغلوب نہ ہونے دے !

پھر آج کی دُنیا نے انشاء جن فرسودہ اور پامال روین پر چلی جا رہی ہے وہ بھی کسی سے مخفی نہیں، شہریت اور موسیقی عبارت کی جان ہیں، لیکن جہاں تک میں نے غور کیا، اکثر شائقینِ جنہیں محض پریس کا نام بدنام کرنا اور اپنا وقت ہی ضائع کرنا آتا ہے، یا بالفاظِ دیگر نمائش کا ایک چھوٹا سودا دماغ میں سما یا ہوتا ہے، قطع نظر اس سے کہ زبان و ادب کی کوئی مقول خدمت سرانجام پائے یا نہیں، اس معاملہ میں بھی ناکام کوشش کرتے دکھائی دیتے ہیں، میں نہیں سمجھ سکا کہ وہ قلم تو اٹھاتے ہیں، لیکن قلم کا حق

کیوں ادا نہیں کرتے، کیا ان کے سینے میں دل اور اس دل میں کسی قسم کی توانائی نہیں ہے؟ — اگر ہے، تو ان کی تحریریں کیوں استقدر بے جان اور پڑمردہ ہوتی ہیں، وہ بیان کا حق کیوں ادا نہیں کرتے؟..... کیا انہیں معلوم نہیں کہ :-

دلبری بے قاہری جادوگری ست دلبری باقاہری پیغمبری ست
اور کیا وہ اس حقیقت سے بیخبر ہیں کہ :-

افسردگی نہیں طرب افشاۃ المتفات ہاں درد بچکے دل میں مگر جا کر جو کوئی
خدا را وہ سمجھیں، اور سمجھنے کی کوشش کریں، کہ تحریر کا فن علاوہ قدرتی
مناسبت کے قلب و جگر کو خون کر دینے سے حاصل ہوتا ہے، اور یہ تو پھر
قدرت کا احسان ہے، جسے چاہے عطا کرے،

ہزاروں سال نرس اپنی بے لونی روتی ہو بڑی شکل سی ہوتا ہی چین میں دیدہ و پیدہ
اور پھر :-

نہر کہ طرف کلمہ کچ نہا و زندہ شست کلاہ داری و آئین سروری داند
سینے حضرت! خامہ مضراب بنجائے، اور بین السطور سے زندگی کے نغمے
عوو کرتے ہوئے دکھائی دیں، جب تو ہے تحریر ورنہ کچھ نہیں!

اور پھر شعر؟، سخن فہمی کا ادعا؟ — یہ تو ہیں بھی بہت بڑی چیزیں،
اسوقت کتنے لوگ ہیں، جو شوق تو ظاہر کرتے ہیں، لیکن صلاحیت بالکل
نہیں رکھتے، کیا یہ وہی لوگ نہیں، جن کی نسبت قرآن حکیم نے بھی کہا :-
لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُوْنَ بِهَا

وَلَهُمْ أَذَانٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَٰئِكَ كَمَا الْأَنْعَامُ بَلْ هُمْ
 أَضَلُّ ۖ اُن کے سینے میں دل تو ہیں، لیکن محض گوشت کے چند ٹوٹے کے
 بصیرت سے یکسر عاری؛ ان کی آنکھیں تو ہیں، لیکن ایسی کہ چشمِ نرگس کی طرح
 کچھ دیکھ نہ سکیں، وہ کان تو لئے پھرتے ہیں، لیکن اس طرح کہ گویا کچھ سُن
 نہیں سکتے، پس یہ لوگ چوپایوں کی مانند ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ!
 ایک پتھر میں تو رقت اور گداز کا مادہ پایا جاسکتا ہے، لیکن ایسے نااہل
 گویا مٹی کی ایک بے جان مورت ہیں، کہ نہ توازن و حرکت کر سکیں، اور نہ کوئی
 دوسرا ان سے ہمکلام ہو سکے: ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ فَهِيَ
 كَالْإِجَادَةِ أَوْ أَشَدَّ قَسْوَةً، وَإِنَّ مِنَ الْإِجَادَةِ لَمَّا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْأَنْهَارُ
 وَإِنَّ مِنْهَا لَمَّا يَنْشَقُّ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاءُ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَّا يَنْهِي ط
 مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ، وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۖ: "اے نادانوا! پھر
 لگاتار غافل رہنے سے تمہارے دل پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو گئے، کیا
 تم بہت سے پتھر ایسے نہیں دیکھتے، کہ ان سے نہریں جاری ہو جاتی ہیں،
 وہ پھٹتے ہیں، اور پھٹنے پر ان سے ٹھنڈے اور میٹھے پانی کے چشمے ہر طرف
 بہ نکلتے ہیں، پھر انہیں میں ایسے پتھر بھی ہیں، جو خوفِ خداوندی سے
 بے اختیار رُمنہ کے بل گر پڑتے ہیں؛ کیا انہیں دیکھ کر بھی تمہاری چشمِ بصیرت
 داہنیں ہوتی؟ — یاد رکھو کہ خدا تمہاری حرکات و سکنات سے ہر
 وقت باخبر رہتا ہے!"

کیا نیٹش نے بھی ایسے ہی کورباطن اور نااہل لوگوں کی نسبت

نہیں کہا تھا کہ :- ”جو لوگ حکمت کے فیض سے محروم ہوں، انہیں بھیڑ
 بکریوں کا ایک گلہ سمجھنا چاہیئے، اے دوست ! ان سے کوسوں بھاگ اور
 انہیں اپنے قریب بھی نہ بٹھکنے دے، اس لئے کہ وہ تیرے دل کو بیمار کر دینگے،
 وہ گندگی اور غلاطت پر بیٹھنے والی زہریلی مکھیاں ہیں، جو ایک دفعہ چھو جانے
 سے بھی تجھے مسموم کر کے چھوڑیں گی، بھاگ ! بھاگ ! ان کے سائے سے
 بھی نفرت کر، اسی میں تیرا بچاؤ ہے، انہیں اس خطرناک حالت میں نہ رہنے
 دے، اور اپنا دامن محفوظ رکھتے ہوئے ان روشن فضاؤں میں پرواز کر جا،
 جہاں سورج پوری تیزی کے ساتھ چمکتا ہے، ہوائیں پہاڑ کی چوٹیوں سے
 کھیلتی، اور سرسبز دشا داب وادیوں سے گزرتی ہوئی تجھ تک پہنچتی ہیں،
 اور جہاں تیرے سر پر بجائے چمکاؤں یا کبوتروں کے، عقاب اور شکرے
 ایک حاکمانہ شان سے منڈلاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں،“ گویا :-
 میان شاخساراں صحبت مرغ چین کتبک تنے بازو میں ہو پہاڑ شاہین ہستانی
 اور اسی ضرورت کو لحاظ رکھتے ہوئے خیام نے بھی کچھ بے جا تو نہیں
 کہا تھا :-

بامرد پاک اصل و عاقل آمیز دننا ہلاں ہزار فرسنگ گریز
 گرزہر وہد تر آخر و مند بنوش درلوش رسد دوست نا اہل بریز
 اور پھر سعدی نے بھی اپنے قول میں کچھ زیادتی تو نہیں کی :-
 زجاہل گریزندہ چوں تیر باش نیامیختہ چوں شکر شیر باش
 سرجاہلاں بر سر دار بہ کہ جاہل بخواری گرفتار بہ

آہ! کیا خوب فرمایا ہے اکبر مرحوم نے بھی :-

کیا تم سب کہیں جہاں کو کیسا پایا غفلت ہی میں آدمی کو ڈوبا پایا
 آنکھیں تو بے شمار دیکھیں لیکن کم تھیں بخدا کہ جن کو بینا پایا
 — اگر فی الواقع انسان میں نظر پیدا ہو جائے تو پھر وہ دیکھے کہ اس کا
 وجود بھی اک شعر ہے، ارض و سما کی تکوین بھی شعر ہی سے ہوئی ہے، اور پھر
 ذات خداوندی کو بھی شعر ہی نے بے حجاب کیا! — اگر خدا کو ایک شاعر نے
 مشاہدہ نہیں کیا ہے، تو کیا تم خیال کرتے ہو، کہ وہ خشک ملاؤں اور جڑو نشین
 صوفیوں کے ہاں جلوہ پیرا ہٹا ہوگا؟ — ہرگز نہیں! دل کی بات دل کے
 سوا اور کون بنا سکتا ہے :

حدیث عشق و مہرستی زمن بشنوند از واعظ کرباجام و سبو ہر شب قرین ماہ و پروہ نیم!
 اور پھر :-

راز دہن پر وہ نردندان مست پُرس کیں حال نیست صوفی عالی مقام را
 اور پھر اس سے بھی گذر کر :-

ما در پیالہ عکس رخ یار دیدہ ایم اے بیخیز لذت شرب مدام ما!
 پھر مضامین کے اندر جدت کا پیدا کرنا انسان کا ایک طبعی حق ہے، لیکن اکثر
 صاحبان کو، جو تقلید کو اپنا وصف امتیازی خیال کرتے ہیں، اس میں بھی قاصر
 پایا گیا، وہ فراموش تو سہی کہ افسردہ خیالات اور دُور از کار مباحث ہی کو دُور اتے
 چلے جانا، اور موت و حیات کے لاینحل عقودوں میں اپنے آپ کو گم کر دینا
 کہاں کی عقل مندی ہے، کیا زندگی اپنی فطری قوتوں ہی سے اپنے حقوق کو

حاصل نہیں کر سکتی تھی، اور کیا وہ کائنات کی جان ہوتے ہوئے بھی اتنی ہی ناکارہ اور کمزور چیز تھی؟ — جیہے اس سعی لا حاصل پر، اور صد ہزار افسوس ہے، اس کاوش پر جس کا کوئی مقصد نہ ہو،

آہ! جن لوگوں کو، خَلَقَ الْإِنْسَانَ وَعَلَّمَهُ الْبَيَانَ: ”ہم نے انسان کو پیدا کیا اور حسن بیان کی تمام توفیق اسے عنایت کر دیں“ اور پھر عَلَّمَ بِالْقَلَمِ، وَعَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ: ”ہم نے انسان کی تعلیم و تدریس قلم کے ساتھ کی، اور اُسے وہ کچھ سکھلا دیا جسے وہ کبھی جانتا ہی نہ تھا“ — کا مصداق ہونا چاہیئے تھا، ان کی جلوہ ریزی آج کس نقاب میں ہوتی ہے، اور آنکھیں کیوں اپنے جذب کشش ہی سے ایسا پیکر بنا کے میرے سامنے کھڑا نہیں کر دیتیں :-

ڈھونڈھے ہو اس معنیٰ متنش نفس کو جی جس کی صدا ہو جلوہ برق فنا مجھے
ہاں تو نہیں نہیں، ہم اپنے جذبات کو پڑمردہ کیونکر مرنے دے سکتے ہیں
معمولی سوالات عمل کے راستے میں کب حائل ہوتے تھے، اور ہم اس مقام
پر کائنات کے ارتقائی قانون کو کس لئے فراموش کر دیں؟ — ہو گا! یہاں
سب کچھ ہو گا!! ایسی ہستیاں بھی پیدا ہوں گی، تلافی کی جائیگی، اور اُمید
کی روشن مشعل کو ہاتھ میں لیئے ہوئے دل منزل مقصود کی جانب بڑھیں گے،
شام غم لیکن خبر دیتی ہے صبح عید کی
ظلمت شب میں نظر آئی کرن اُمید کی

آدم برسر مطلب

پس انہیں حالات کے پیش نظر مدت سے یہ خیال تھا، کہ بجائے اس کے کہ اپنے اوقات کو بحث و تہیص یا افسوس و حسرت ہی میں ضائع کر دیا جائے، ایک ادارہ ادبیہ کا قیام عمل میں لایا جائے، جس کا مقصد مسلمانوں کے علمی اور ادبی ذوق کی اصلاح کے ساتھ ہی ساتھ انہیں اسلام کے صحیح فلسفہ سے رُوشناس کرانا ہو، لیکن ظاہر ہے کہ اس شاندار مقصد کا افتتاح اس وقت تک بالاستقلال عمل میں نہیں لایا جاسکتا تھا، جب تک کہ بہتر سے بہتر اور عمدہ سے عمدہ کتابوں کا ذخیرہ بذات خود مہیا نہ کر لیا جاتا، کیونکہ میں جانتا تھا کہ اگر بغیر اس کے کام کو شروع بھی کر دیا گیا، تو اس کی حیثیت اس سپاہی سے زیادہ نہیں ہو سکتی، جو انتہائی جوش و خروش کے ساتھ میدان کارزار میں کود پڑے لیکن ہتھیار اس کے پاس ایک بھی نہ ہو، سو الحمد للہ کہ یہ آرزو بھی جس شان سے کہ میں چاہتا تھا پوری ہوئی !

آج میں بے حد مسرور ہوں کہ دارالتالیف ہند کی طرف سے پہلی کتاب شائع ہو کر ناظرین کے ہاتھوں تک پہنچ رہی ہے، اس کام کو یہیں تک محدود نہیں سمجھ لینا چاہیئے، بلکہ بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ میری تشنگی کے سامنے اس کی حیثیت ایک قطرے کی حیثیت بھی نہیں :-

بقدر ظرف ہر ساقی خوار تشنہ کا مے بھی جو تو دریا ٹوٹے تو میں خمیانہ ہوں حل کا اور حق تو یہ ہے کہ :-

دکھاؤنگا تماشا دمی اگر فرصت زمانے فی مراہِ داغ دل اک تخم ہے سر و چراغاں کا
 ہاں اس ضمن میں معزز ناظرین پر بھی ایک فرض عائد ہوتا ہے اور وہ یہ کہ جہاں
 وہ خود اسے ایک ملی اور اجتماعی خدمت تصور کرتے ہوئے ہر ممکن ذریعہ سے اس میں
 حصہ لیں، وہاں دوسروں کو بھی اس جانب توجہ اور رغبت دلانے میں کوئی دقیقہ
 اٹھانہ رکھیں! اس کام کی بنامیری ذاتی اغراض پر نہیں ہے، بلکہ یہ زبان کی
 وسعت اور بقا کا سوال ہے، اس کا مطمح نظر ادب، اور ادب کے ساتھ اسلامی
 تہذیب کو طرز جدید کے مطابق از سر نو زندہ کرنا ہے، پس اس مقصد کی اہمیت
 کو میرا علم و دست طبقہ بذات خود بہت اچھی طرح سے سمجھ سکتا ہے، اس مرکز
 کو جتنا بھی قوی بنایا جائیگا، اسی قدر کامیابی کے ساتھ ہم اپنے کام کو جاری رکھ
 سکیں گے، سو آئیے اور آج اپنی سلامتی، ذوق اور غیرت ملی کا پور پورا ثبوت
 بہم پہنچائیے :-

دورہ منزل لیلے کہ خطر ہاست بجاں شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی
 — اس راہ میں جب تک اٹیار اور ہمدردی کا مظاہرہ نہیں کیا جائیگا، کام
 خاطر خواہ طور پر سرانجام نہیں پاسکتا، یہ تو صاحب ذوق اور صاحب ثروت
 حضرات کی سرگرمی اور فراخ دلی ہی ہے، جو اس متحدہ اور مرکوز نظریہ کو زیادہ سے
 زیادہ شاندار صورت میں ہمارے سامنے لاسکتی ہے،

پیش نظر کتاب اسی سلسلہ کی سب سے پہلی کڑی ہے، یہ مسئلہ کہ
 میں نے کیوں اسے سب سے مقدم رکھا، غالب کی شخصیت اور اس کی
 موجودہ ہر دلہریزی، خود دل کئے دیتی ہے، میں بھی اس میخانہ میں ایک پرانا

رند ہوں، جب بھی ضرورت پیش آتی ہے، پیمانہ و سبکی جگہ غم کے غم نوش
کئے ہیں، اور پھر بھی تسکین نہیں ہوئی۔

تازہ نہیں ہر نشہ فکر سخن مجھے نیا کی قیدم ہوں دو چہ درخ کا
ساقی ازل نے اسی روز مجھے سب کچھ عنایت کر دیا تھا، جبکہ دوسرے لوگ
ابھی مستی کے عالم میں پڑے خراٹے لے رہے تھے۔

فنا آموز درس پیچودی ہوں اس زمانے سے کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوار و بستاپہر
دوسرے کو جن ذخائر کے لئے تحقیق اور ورق گردانی کی ضرورت پیش آتی
ہے، وہ بفضلہ تعالیٰ یہاں دماغ میں محفوظ، اور نظر کے سامنے پھیلے ہوئے
ہیں:

سچ کہ ذوق طلب رجعتجو بازم نہ داشت دانہ می چیدم دریاں رونے کے خرمین دہستم
میں نے ہمیشہ سے اپنی آنکھوں کو وقف گریہ رکھا ہے، قطرے کی جگہ دریا
اور دریا کی جگہ سمندر بہا دینے سے بھی دریغ نہیں کیا، اور پھر اسی میں سیر و عالم
کے مزے لوٹے ہیں، مجھے اپنے مرشد کا قول بھی وِرد زبان ہے:-

ہے نگ سینہ دل اگر آتشکدہ نہ ہو ہے عار دل نفس اگر آذر فشاں نہیں
خجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دو نیم دل میں چھری چھو مژہ گر نوچکاں نہیں
— میری بڑھتی ہوئی قوتیں کبھی شرمندہ ساحل نہیں ہوئیں، محض درسی
کتابوں یا یونیورسٹی کے مقرر کردہ نصابوں پر میں نے کبھی اکتفا نہیں کیا،
اور رسم و رواج کے سیفینے اکثر اوقات ایک ایک ٹھوکریں غرق کر دیئے ہیں،
اور ایسے غرق کئے ہیں کہ انکا نام و نشان بھی بھٹکانہ نہیں کرتا، لیکن یہ سب کچھ کیوں؟

اور یہ خود داری کس لئے ہے؟

محض اس لئے کہ انسانی عظمت اسی کو چاہتی ہے؛ اخلاق کا یہی تقاضا ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ غالب بھی بجائے خود اسی مسلک کا انسان تھا، جب وہ عامیہ حیثیت میں کسی کی شرکت کو اپنے لئے گوارا نہیں کرتا تھا تو اس کا ایک سچا معتقد بھی اس پست اور کمزور خیال پر کس لئے قانع ہو جاتا، آہ! :-
میں اہل خرد کس روشِ خاص پہ نازاں پالبتگیِ رسمِ درہِ عام بہت ہے
اور پھر :-

ز بسکہ پیرویِ خلق گمراہیِ آرد نمی رویم بہ را ہے کہ کارواںِ فتنہ است
پس :-

راہے کہ خضر داشت ز سرِ حشیمہ دور بود لب تشنگی ز راہِ دگر بردہ ایم ما
الغرض ایک عمر اسی دشت کی سیاحی میں بسر کی، دنیا ئے ادب کا گوشہ گوشہ چھان مارا، ذروں میں خورشید کی چمک، اور کانٹوں میں پھول کی جھمک پائی، بلبل کی خوش الحانیاں بھی سنیں، اور کوسے کی سامعہ خراش صدائیں بھی سُننے میں آئیں، طبیعت نے جب کسی خلاف بات پر اکرہ کیا، تو اسے یوں کہہ کر سمجھا بھی لیا کہ :-

بر اہلِ ذوق و فیض در نمی بندد نوائے بلبل اگر نسبتِ صوتِ زار غشود
لیکن ان تمام باتوں کے باوجود جو رنگینی اور بلاغتِ مرزا کے کلام میں دیکھی کسی اور کے ہاں اس کا عشرِ عشرِ بھی نہ پایا، اور یہ ایک ایسی ناقابلِ انکار حقیقت ہے، جس پر غالب نے خود بھی کہا :-

ہیں اور بھی دنیا میں سخنِ بہت اچھے کہتے ہیں کہ غالب کا ہر "اندازِ بیان" اور

پس اس فوقیت کے پیش نظر اولاً میں نے چاہا تھا، کہ دیوان ہی کی ایک مکمل اور مبسوط شرح طیار کر دوں، تاکہ مشرق کی یہ زندہ جاوید سہتی بنائے زمان کی غفلت، اور کوتاہی کی بنا پر اپنی اصلی اور حقیقی شان سے محروم نہ رہ جائے لیکن پھر خیال ہوا، کہ اس سے بھی زیادہ احتیاط کو ہاتھ سے نہ دیتے ہوئے ابتداءً ایک مقدمہ لکھ دیا جائے، جس میں غالب کا فلسفہ اور کمال فن اپنے ہر ممکن پہلو کے ساتھ، مخصوص عنوانات کے ماتحت ناظرین کے مشتاق، تھپ تک پہنچ جائے، سو چیز آپ کے سامنے موجود ہے، جس کے لئے میں کسی ذاتی کمال کا مدعی نہیں ہوں، اور نہ ہی مجھے کسی حیثیت سے اپنی قابلیت کا اظہار منظور ہے، لیکن ساتھ ہی اتنا عرض کئے بغیر بھی نہیں رہ سکتا، کہ خدائے ذوالجلل نے اس عاجز سے وقت کی ایک اہم ترین ضرورت کو پورا کر لیا ہے، جس کیلئے اس ذات کبریا کا جتنا بھی شکریہ بجالایا جائے، اتنا ہی کم ہے، آج یہ چیز جو سامنے آئی ہے، تو وہی سالہا سال کا پیدا کیا ہوا جوش تھا، کہ یکا یک ایک جوئے تنویرین کے میرے خامہ سے بہ نکلا ہے، ایک ہریان دوست کا تقاضا، اسپر مرزا کے المامی نعموں کا پیدا کیا ہوا ارتعاش، بس پھر کیا تھا، چند روز کے قلیل عرصہ میں اسے مکمل کر کے رکھ دیا!

اس کتاب کو فی الحقیقت دو ابواب پر منقسم کیا گیا ہے، پہلے باب کو فن شاعری کے متعلق ایک مختصر اور عمل تبصرہ خیال کرنا چاہیے، جو ایک طور پر تعارف کی حیثیت رکھتا ہے، اور دوسرا باب خالصتاً مرزا کی شاعری اور اس کے مباحث پر مشتمل ہے، میں نے اس دو باب میں نفسیات شعری کو

خاص طور پر نمایاں کر دیا ہے، سکولوں اور کالجوں کی سائنس لوجی سے میں اس لئے شاکى ہوں، کہ اس میں دلچسپی یکسر مفقود ہے، دلائل کی کمی سے انسانی ذوق کو خاطر خواہ طور پر تسکین حاصل نہیں ہوتی، معافی کا جلوہ کہیں بھی دکھائی نہیں دیتا، پروفیسر بھی ”علی“ کی جگہ صرف ”نظری حیثیت پر اکتفا کر لیتے ہیں، انہیں چاہیئے تھا، کہ طلباء کی ضرورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے، انسانی جذبات کو کسی قدر گہری نظر سے ملاحظہ فرماتے، اور اس علم میں جو باتیں انہیں ایک طور پر مہموم اور ناممکن سی معلوم ہونے لگی ہیں، انہیں حتی الوسع ممکن کر کے دکھلا دیتے اس مقصد کی تعمیل زیادہ تر انسان کی قلبی اور روحانی صلاحیت پر موقوف ہو، اور یہ پھر منتظمین کا فرض ہے، کہ وہ طلباء کی آئندہ زندگی کو شاندار بنانے کے لئے اس معاملہ میں زیادہ سے زیادہ احتیاط سے کام لیں!

طلباء اگر بذات خود غور کریں، تو انہیں اس کتاب میں نفسیاتی حقائق کے باوجود، دلچسپی اور فرحت کے بہت سے اسباب دکھائی دیں گے جن سے وہ اس علم اور اس علم کے معنوی اور فوٹی کمالات کو بھی کافی حد تک جان لے سکتے ہیں،

بالآخر بارگاہِ خداوندی میں دستِ بدعا ہوں، کہ اس ارادہ کی وہ خصوصیت جن کی سوسائٹی کو اس وقت اشد ضرورت ہے، اور وہ انہیں تاحال کما حقہ حاصل نہیں کر سکی، تائیدِ ایزدی سے اتمام کو پہنچ جائیں، تاکہ

۱ Practical

۲ Theoretical

فطرت کی وہ نورانی دنیا، جو ہوس کی تاریکیوں سے مملو ہو چکی ہے، صداقت
 کے احساس، اور محبت کی قدر شناسی سے اپنی شان کو دوبارہ حاصل
 کر لے، آمین ✽

طارق

۱۰ جنوری ۱۹۳۵ء



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

باب اول

مبادیات

غالب مشرق کا ایک نہایت ہی بلند پایہ فلسفی اور ماہر نفسیات تھا، اُس کا کلام سراپا الہام ہے، زندگی کا کونسا ایسا نغمہ ہے، جو مرزا کے سازِ دل سے اٹھتا ہوا دکھائی نہیں دیتا، اور کونسی ایسی دردناک صدا ہے جو فضا ئے آسمانی میں گونجتی ہوئی سنائی نہیں دیتی، مرزا کا پیغام حقیقت میں رُوح القدس کا پیغام ہے! لیکن قبل ازیں کہ ہم اس پیغام کو تفصیلی رنگ میں ناظرین کے سامنے پیش کریں، خود علم النفس، شعر کی ماہیت، دونوں چیزوں کا باہمی ربط و ضبط اور شاعری کے لوازمات پر ایک سیر حاصل تبصرہ ہو جانا چاہیئے، ورنہ اس کے بغیر دیوان غالب کی شرح اور خود وہ بحث بھی جو مرزا کے خصوصیات کلام پر آئندہ کی جانے والی ہے، ایک طور پر ناقص اور تشنہ سی رہ جائے گی :-

علم النفس کا کام کسی چیز کے حقیقی اور فطری اسباب و عوامل

علم النفس

کو صحیح اور غیر مشکوک طور پر معلوم کرنا ہے، بہت ممکن ہو سکتا ہے، کہ ایک معمولی سمجھ کا انسان کسی واقعہ سے متاثر ہو کر محض اس کے ظاہری وجوہ پر قناعت کر لے، اور اس کی کم نظری یا کو زوقی اس مبہم اور نامعلوم کیفیت سے اس کے دل و دماغ کو محروم رکھے، جو ایک شاعر فطرت اور ماہر نفسیات کا حصہ ہوا کرتا ہے؛ مثال کے طور پر چونکہ غالب کے کلام سے بہتر نمونہ اس مقصد کے لئے اور کوئی نہیں ہو سکتا، اس لئے دو ایک شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں، ملاحظہ ہو :

شمع بجھتی ہی تو ایں سی دہواں اٹھتا ہے شعلہ عشق سیہ پوش ہوا میسے بعد
 کون نہیں جانتا، کہ شمع کے بجھتے وقت ایں سے دہواں اٹھا کرتا ہے
 ہم تم اس حالت کو روزمرہ دیکھتے ہیں، اور بظاہر ایں کوئی خاص بات نہیں
 پاتے، لیکن شاعر کی نگاہ حقیقت اس اسی معمولی واقعہ سے ایک ایسا مضمون اخذ
 کرتی ہے، جو سوز و اثر کے لحاظ سے اپنی تمام معنوی کیفیات کو حاوی ہے !
 ہم سے کوئی اس کی علت دریافت کرے، تو زیادہ سے زیادہ سے زیادہ اتنا
 بتلا سکیں گے، کہ شمع بجھ جانے کے بعد چونکہ اس کا قبیلہ تھوڑی دیر کے لئے جلتا
 رہتا ہے، اس لئے دہوئیں کا اٹھنا لازمی ہے، لیکن شاعر اپنی بلند نظری
 سے اس کی وجہ یہ بتلائیگا، کہ عشق کو جس شان و احترام سے ہم نے اپنے دل
 میں جگہ دی تھی، اس طرح امید نہیں، کہ ہمارے مرنے کے بعد کوئی دوسرا شخص
 بھی یہ حق سجالا سکے، پس شعلہ عشق اسی غم میں دہوئیں کی مثل ایک ماتمی
 لباس زیب تن کئے ہے، گویا :

آئے ہو بیکسی عشق پہ رونا غالب کس کے گھر جائیگا سیلاب بلا میے بعد
اسی طرح ایک اور مثال لیجئے :

ثابت ہوا ہر گز دن مینا پہ خونِ خلق لڑے ہو موج مے تری رفتار دیکھ کر
عام نظر دل میں صراحی کے اندر شراب کا لرزنا اور تھر تھرا نا کچھ بھی وجہ
رکھتا ہو، لیکن ایک فلسفی کا دماغ یہاں بھی ایک ایسا نتیجہ اخذ کریگا، جو نفسیاتی
اعتبار سے ایک بہترین نتیجہ ہو، اور پھر غروریت کا رنگ بھی فوت ہونے نہ پائے
.... اس واقعہ کا اس سے زیادہ لطیف اور نازک سبب اور کیا ہو سکتا ہے
کہ محبوب نے ضرورت سے زیادہ شراب پی لی ہے، اور اس وجہ سے وہ لڑکھڑاتا
ہوا چلا جاتا ہے،

حسینوں کی رفتار بجائے خود ایک قیامت ہے، پھر شراب کا نشہ ایک
قہر مزید، پس ایسی حالت میں کتنے دل خون نہ ہو گئے ہونگے، تو موج شراب
صراحی کے اندر اس خوف سے تھر تھرا رہی ہے، کہ اتنے لوگوں کا خون چونکہ اسی
کے سبب سے ہوا، لہذا انہیں معلوم کہ اس جرم کی پاداش میں اس کے ساتھ
کونسا سلوک روا رکھا جائے، گویا :

ہے ایک خلق کا خون سر پہ اشکِ خوں کے مرے
سکھا دی چال اسے دامن اٹھا کے آنے کی (مومن)

اب ناظرین خود اندازہ فرمائیں، کہ ایک عام شخص اور فلسفی کے
نقطہ نگاہ میں کتنا فرق ہوا کرتا ہے
. بین تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

ایک اشیاء کو ان کی ظاہری صورت سے جانچتا ہے، تو دوسرا ان کے حقیقی اور نفسیاتی اسباب و وجوہ معلوم کرنے کی فکر میں ہے، ایک کسی اہم سے اہم اور عجیب سے عجیب چیز کو بھی سطحی نظر سے دیکھ جاتا ہے، تو دوسرا ایک معمولی سے معمولی اور حقیر سے حقیر شے کو بھی تعمق اور گہرائی کی نظر سے دیکھتا ہے، یہ ہے فرق ایک عام اور خاص حالت کا اور یہی ہے وہ اصول جس پر علم النفس کے تمام چھوٹے بڑے مباحث کی بنائیں استوار ہوتی ہیں !

شعر کی ماہیت اور شاعری کے لوازمات

یہ امر واضح ہو جانا چاہیئے، کہ شاعری کا ملکہ بھی ایک فطری اور وہی چیز ہے، جس میں ذاتی کوشش کو بہت کم دخل ہے، مان لیا کہ ایک شخص عرصہ و راز کی محنت اور کد و کاوش سے چند متداول بحریں یاد کر لیتا ہے، علم عروض، علم بیان، اور علم بدیع وغیرہ کے چند ضروری اور اہم مسائل بھی اسے ضبط ہو چکے ہیں، لیکن شاعری محض انہیں چند قواعد سے عبارت نہیں ہے، شاعر اپنے سامنے ہر قسم کے ہتھیار بکھرے ہوئے دیکھتا ہے، لیکن یہ تمام ہتھیار اس وقت تک بالکل بیکار اور ننگ آلود ہیں، جب تک آسمانی تجلیات اور فطری تاثیرات کا صیقل انہیں صاف اور روشن کر کے استعمال کے قابل نہ بنا دے، شاعری حقیقت میں خدا کی ایک پاک اور برگزیدہ امانت ہے، کہ اس کے اہل بھی خاص خاص لوگ ہوا کرتے ہیں، جھوٹے مدعی اور نام کے شاعر اس وقت بہت

پیدا ہو جائیں گے، لیکن محض ان کا یہ دعویٰ ہی سچائی کی دلیل نہیں ہو سکتا؛

چمن میں لالہ دکھاتا پھرتا ہے داغ اپنا کلی کلی کو ۳

یہ جانتا ہے کہ اس دکھائے سے دل جلو نہیں ٹھما ہوگا

الشُّعْرَاءُ قُلُوبُ الرِّحَمٰنِ ایک بتن اور ناقابل انکار حقیقت

ہے، اور اس میں بھی شک نہیں کہ عجمی شاعری جزوے ست از پیغمبری....

اس فن شریف کی پاکیزگی اور تقدس کو اس سے بھی زیادہ لطیف اور نازک

انداز میں سمجھنا چاہتے ہو تو ان تین الفاظ پر غور کرو: شعر، عرش اور شریع

یہ الفاظ اگرچہ شکل و صورت اور مفہوم کے لحاظ سے مختلف ہیں، لیکن مقاصد

کے لحاظ سے تینوں کے تینوں ایک ہی وجدانی کیفیت کے حامل ہیں، سن،

ع اور زادہ ان سب کا ایک ہے، شعر کا اصلی مقام سدرۃ المنتہی سے

بھی پرے عرش کا مقام ہے، جہاں سے دہ شاعر فطرت کے دود بھرے

دل پر نزل کرتا ہے، پھر وہ شاعر انہیں تاثرات کو لے کر ایک موزون صورت

میں قوم کے لئے سامان حیات فراہم کرتا ہے! لیکن وہ شاعر جو اپنے

انداز ایسی شان پیدا کرنا چاہے، جسے ”پیغمبری“ کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے

ایک ایسا انسان ہونا چاہیے، جو قدرت کی بہار کا دل کھول کر تماشا کرنے

والا ہو، قوموں کی تاریخ ہر لمحہ عبرت کا ایک نیا منظر اس کی آنکھوں کے

سامنے پیش کرے، حقیقت میں شاعری کی تکمیل نہیں ہو سکتی، جب

تک کہ کائنات قدرت کا وسیع اور غیر محدود طور پر معائنہ نہ کیا جائے،

یہ ایک ایسا لطیف اور مسرت بخش احساس ہے، کہ جس کی تکمیل سے

مردہ دلوں کے اندر بھی زندگی کی ایک برقی رو دوڑ جاتی ہے، اور ایسی حالت میں ہر مشاہدہ وہ کیفیت پیدا کرتا ہے، جو ایک سچے شاعر کے لئے سزاوار ہے، ... کتابوں کا بکثرت مطالعہ کرنا بیشک ایک مستحسن فعل ہے، لیکن اس فعل سے طبیعت میں جو لکان اور افسردگی سی پیدا ہو جاتا کرتی ہے، اس کا ازالہ بھی سیر و تفریح کے علاوہ کوئی دوسری چیز نہیں کر سکتی؛ دوران مطالعہ میں بعض باتیں انسانی ذہن کے اندر ایسی ناقص اور مشتبہ رہ جاتی ہیں، کہ انہیں قدرت کا وسیع اور بے دریغ فیضان ہی یقین اور اطمینان سے بدل سکتا ہے، تو گویا بقول آقبال :-

علم کے حیرت کدی میں ہی کہاں اسکی نمود گل کی پتی میں نظر آتا ہی راز ہست نبود
اور پھر قدرت کی بہا رہ جائے خود اس قدر بے پایاں ہے، کہ انسان ہی اسے تماشا کرتے کرتے تھک جائے، تو تھک جائے، وہ ختم ہونے میں نہیں آتی میر انیس فرماتے ہیں :

گلشن میں پھروں کہ سیر صحرا دیکھوں یا معدن کوہ و دشت و دریا دیکھوں
ہر جہا تری قدرت کے میں لاکھوں جو جہاں ہوں کہ دوا لکھوں سو کیا کیا دیکھوں
یہی وجہ ہے، کہ دنیا میں جتنے بڑے بڑے شاعر ہوئے ہیں، وہ قدرت کی زیر نگینوں کا دل کھول کر تماشا کیا کرتے تھے :

بخشم ہر جلوہ گل ذوق تماشا غالب چشم کو چاہیے ہر رنگ میں داہو جانا
— روئے زمین پر بسنے والے انسانی قبائل، اور ان کے مختلف عادات و اطوار اور عجیب و غریب خصائل کو دیکھتے تھے، کہیں دامن کوہ میں پھیلے

ہوئے خود رو پھول ان کے دلوں میں حیات تازہ پیدا کرتے ہیں، تو کہیں
 ہلہکتے ہوئے سبزہ نار ان کی رُوح کو جذب کئے لیتے ہیں، کہیں نغے نغے
 پرندوں کے لطیف اور پرسوز نغے ان کے پہلو میں گد گدی پیدا کرتے
 ہیں، تو کہیں چٹنے کی شورشوں میں وہ آسمانی الوہیت کا پرسکون پنہام
 گوش دل سے بیٹھے سنا کرتے ہیں، شکستیر کو دیکھئے کہ باتوں باتوں میں
 انسانی فطرت کے وہ وہ دقیق نکات بیان کر جاتا ہے، کہ گویا یہ بھی ایک
 پہلے ہی سے جانی بوجھی بات تھی، ملٹن کی شہرہ آفاق نظم ”گمشدہ بہشت“
 ہی کو دیکھ جائیے کہ اس میں حقیقت اور فطرت کی کیا کیا نیزنگیاں دکھائی دیتی
 ہیں، ... اسی طرح **شیخ** بھی اگر کائنات کو کسی قدر گہری نظر سے نہ
 دیکھتا، تو اس کا ”فلسفہ محبت“ اور فلسفہ رُوح جسے وہ اپنی غیر فانی
 نظم ”سکائی لارک“ میں مختلف تشبیہات اور استعارات سے حل کرتا
 ہے، اس قدر مقبول اور کامیاب ثابت نہ ہوتیں، **سر والٹر سکاٹ** اپنی
 نظموں میں جس خوبی سے مناظر قدرت یا تاریخی کھنڈرات کو پیش کرتا ہے
 وہ کوئی نئی چیز نہیں ہے، گویا واقعات اور حالات کا ایک سماں آنکھوں
 کے سامنے بندھ جاتا ہے، چنانچہ اس کی نسبت بھی نقل کیا گیا ہے کہ
 جب اس کے ایک دوست نے چھوٹے چھوٹے پھول اور پتیوں پر بھی اُس
 پاکٹ بک میں خاص خاص باتیں نوٹ کرنے ہوئے دیکھا، تو کہا کہ ”اس
 دوسرے کیا فائدہ؟“ کیا عام پھول کافی نہ تھے، جو چھوٹے چھوٹے
 پھولوں کو ملاحظہ کرنے کی ضرورت پڑی ”سر والٹر نے جواب میں کہا، کہ

”تمام کائنات میں دو چیزیں بھی ایسی نہیں ہیں، جنہیں بالکل یکساں کہا جاسکے“

بخلاف اس کے ایک طبقہ شعراء کا ایسا بھی ہے، جن کی تمام جولانیاں فحش اور ہزلیات ہی تک محدود ہیں، فریڈرک نیٹشے جرمنی کا مشہور فلاسفر اور ”فوق الانسان“ کا معلم اپنی کتاب ”بقول زرتشت“ میں ایسے لوگوں کی نسبت بیزاری اور نفرت کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے:

”میں شعراء سے تنگ ہوں، قدیم شعراء سے اور جدید سے، وہ سب پایاب پانی میں ہیں، ان کی مثال خشک دریاؤں کی سی ہے، ان کا تخیل تعلق سے خالی ہے، ان کے احساسات سطحی ہیں، تعیش اور رندی کے چند جذبات کے سوا ان کے دیوانوں میں کچھ نہیں“

”ملیقن و استدراک کے ان چند ابتدائی جملوں کے بعد اب ان اہم اور ضروری مسائل کا ذکر کیا جاتا ہے، جو شاعری کے لئے ایک طور پر زیورات کا کام دیتے ہیں:-

فصاحت ان میں سب سے پہلی اور مقدم چیز فصاحت ہے، فصاحت کے معنی یہ ہیں، کہ کلام میں الفاظ اور فقرات کی ترتیب کا اس طور پر لحاظ رکھا جائے، کہ ترکیب میں کسی طرح کی ثقالت پیدا نہ ہو، جواہرات خواہ کتنے ہی خوبصورت اور بیش بہا کیوں نہ ہوں، لیکن انہیں بھی اگر ایک خاص ترتیب سے مناسب صورت میں منسلک نہیں کیا جاتا ہے، تو وہ بھی بد نما اور بھونڈے سے معلوم ہونے لگیں گے؛ پس ایک انشاء پرداز کے لئے

الفاظ کا معاملہ میرے اور جواہرات سے بھی کہیں زیادہ احتیاط کے قابل ہے، بعض اوقات ایک معمولی سی فروگزاشت پر ایک پورا فقرہ بلکہ سارے کا سارا بیان فصاحت کے مرتبے سے گر جاتا ہے !

فصاحت حقیقت میں ایک خدا داد ملکہ ہے، اور اس کا صحیح امتیاز بھی ذوقِ سلیم کے علاوہ کسی دوسری چیز سے ممکن نہیں، کلام میں فصاحت اور روانی پیدا کرنے کے لئے الفاظ نہایت مانتوس و لپسند اور شیریں لانے چاہیئیں، کہ نہ تو ان کے تلفظ میں زبان کو کسی طرح کی رکاوٹ اور دقت پیش آئے، اور نہ کانوں پر ان کا سُنا اور لذتِ یاب ہونا کسی قسم کی گرائی یا کراہیت کا موجب ہو، بلکہ ان میں ایک ایسا سلیقہ پیدا کیا جائے، کہ سامعین پہلے ہی سے انہیں سننے کے لئے خود کو آمادہ اور شتاق پائیں دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا میں یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہی ہم ذیل میں چند مثالیں نقل کر کے اپنے بیان کو واضح کئے دیتے ہیں، میرا تبس کا ایک مصرعہ ہے ع

✓ فرمایا آدمی ہے کہ صحرا کا جالور

اس جگہ صحرا کا لفظ نہایت موزون طور پر مستعمل ہوا ہے، اور بجائے خود فصیح بھی ہے، لیکن اس کی جگہ اسی کا ایک ہم معنی لفظ یعنی جنگل چسپاں کر دیا جائے، تو فصاحت خاک میں مل جائے گی، اور ترکیب کی لطافت ہاتھ سے جاتی رہے گی !

اسی طرح ایک اور شعر ہے :

✓ طائر ہوا میں مست ہرن سبزہ زار میں جگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں یہاں جگل کا لفظ ایسا نگینہ سا جڑ دیا گیا ہے، کہ اس کی جگہ صحرا کا لفظ نہایت بھونڈا اور ناگوار معلوم ہوگا، اسی طرح ایک اور مثال ملاحظہ ہو :

✓ کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا تھا موتیوں سی دامن صحرا بھرا ہوا یہاں اوس کا لفظ نہایت قرینے سے چسپاں کیا گیا ہے، لیکن اسی کی جگہ اس کا ہم معنی اور مرادف لفظ یعنی شبنم لگا دینے سے عبارت کی سلاست اور بیان کی روانی خاک میں مل جائیگی، اور دوسری جگہ شبنم نے بھر دیئے تھے کٹوے گلاب کے

شبنم کی جگہ اوس کا لفظ لانے سے فصاحت مفقود ہو جائے گی،

میرزا و میر کا ایک شعر ہے :

مثل تنور گرم تھا پانی پہ ہر حباب ہوتی تھیں سیخ موج پہ مرغابیا کباب
میر امیس فرماتے ہیں :

پانی تھا آگ گرمی روز حساب تھی ماہی جو سیخ موج جسک آئی کباب تھی
اب ان اشعار کو بغیر ملاحظہ فرمائیے، مفہوم دونوں کا ایک ہی ہے، لیکن پہلے شعر میں یہ مفہوم کسی قدر بھونڈے الفاظ اور بھدے پیرائے میں ادا کیا گیا ہے، اور دوسری مثال میں اسی نقص کے رفع ہو جانے سے بیان میں روانی اور روانی کے ساتھ فصاحت پیدا ہو گئی ہے !

پھر ع

کس نے نہ دی انگوٹھی رکوع و سجود میں (دبیر)
میرانیس فرماتے ہیں:

سائل کو کس نے دی ہے انگوٹھی نماز میں
ایک ہی واقعہ ہے، اور دونوں نے ایک ہی روایت کو نظم بھی کیا ہے، لیکن
دوسری مثال میں محض الفاظ کی موزونیت نے ترکیب میں کتنی موسیقی پیدا
کر دی !

اسی طرح ع

جیسے مکان سے زلزلہ میں صاحب مکان (دبیر)

میرانیس ع

✓ جیسے کوئی بھونچال میں گھر چھوڑ کے بھاگے

یہاں بھی وہی شان دیکھ لیجئے، کہ پہلے مصرع میں گویا الفاظ ایک
دوسرے سے رُوٹھے ہوئے اپنا اپنا دامن بچائے بیٹھے ہیں، اور دوسرے
مصرع میں آبدار موتیوں کی مثل یکے بعد دیگرے ڈھلکتے چلے آتے ہیں !

اس ضمن میں روزمرہ اور محاورہ کو بھی ایک خاص اہمیت حاصل

ہے، اور یہ اس لئے کہ کلام جس قدر بھی روزمرہ اور محاورہ کے مطابق صحیح اور
متنوع طور پر ڈھلا ہوا ہوگا، اسی قدر فصاحت اور لطافت میں بھی بے مثل
ہوگا، اسی طرح سے جتنا بھی روزمرہ سے دور ہوگا، اُسی قدر فصاحت کے
معیار سے بھی گرجا ئیگا، مثال کے طور پر غالب کا یہ شعر لیجئے :

گرچہ ہر طرزِ قافل پر وہ دارِ رازِ عشق پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جاوے

شعربت اچھا ہے، اور بجائے خود ایک خاص کیفیت کا حامل ہے،

لیکن اسی خیال پر مومن کا انداز بھی ملاحظہ ہو :

کل تم جو بزمِ غیر میں آنکھیں چراگئے کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پاگئے

یہاں صرف محاورات ہی کے مناسب استعمال سے شعر میں فصاحت اور روانی پیدا ہو گئی ہے، اور غالب کا شعر اس کے بالمقابل ماند پڑ گیا ہے؛ ہم کہیں چرانا، کھو یا جانا اور پھر اغیار کا پا جانا ایسی خوبی اور تسلسل سے چسپاں ہوئے ہیں، کہ اس کی نظیر نہیں! اسی طرح غالب کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں :

ترے سرو قیامت سے اک قد آدم قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

یہ بھی ایک اچھا خیال ہے، اور مناسب طریق پر ادا بھی کیا گیا ہے، لیکن میر مثنویوں کے ہاں یہی خیال اس طور پر باندھا گیا ہے :

تفاوت قیامت یار اور قیامت میں ہی کیا مثنوی

وہی فتنہ ہی لیکن یاں ذرا سانچے میں ڈھلتا ہی

اس شعر میں روزمرہ کے التزام، اور الفاظ کی بے ساختگی اور گھلاوٹ نے

مضمون کو زمین سے اٹھا آسمان تک پہنچا دیا ہے، بلکہ معنوی لحاظ سے بھی

غور کیا جائے، تو دوسرا شعر پہلے شعر سے ہر اہم بلند ہے، اول تو فتنہ قیامت

ہی کیا کم فتنہ تھا، مزید براں اس کا سانچے میں ڈھل جانا کیا کچھ قیامت برپا

نہیں کریگا!

پس اس بحث سے یہ بھی معلوم ہو چکا، کہ روزمرہ اور محاورہ کا صحیح اور

مناسب استعمال بھی فصاحت کے لئے کافی حد تک معین ثابت ہوتا ہے، اور اس سے بھی کلام میں ایک طرح کی لچک اور موسیقی پیدا ہو جاتی ہے،

فصاحت کے موضوع پر ہم ایک دفعہ پھر اس حقیقت کا اعادہ کئے دیتے ہیں، کہ اس میں جس قدر بھی الفاظ اور فقرات کی تہذیب و ترتیب کا لحاظ رکھا جائیگا، اُسی قدر بیان میں روانی اور انداز میں جدت پیدا ہوگی، اور اس کا خلاف کرنے میں نقصان، تو گویا جس طرح ایک شاعر نے اپنی طرز میں زندگی اور موت کی حقیقت اس طور پر بیان کی کہ :

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب موت کیا ہے انہیں اجزاء کا پریشان ہونا
اسی طرح سمجھ لیجئے، کہ فصاحت کیا ہے ؟ اجزائے کلام میں حسن ترتیب ہے، اور انہیں اجزاء کا پریشان ہونا فقدانِ فصاحت ہے !

بلاغت فصاحت کے ساتھ بلاغت بھی ایک لازمی اور ضروری امر ہے، اگر فصاحت کا خاصہ یہ ہے، کہ وہ کلام میں لطافت اور روانی پیدا کر دیتی ہے، تو بلاغت کی یہ شان ہوگی، کہ وہ اس کلام کو معنوی نقائص سے بھی پاک کر دے، بلاغت واقعات کو ایسی صورت میں ظاہر کرنا ہے، جیسے کہ وہ فی الحقیقت ہیں، مثلاً ہم کسی مرد دانا سے چند ایسے الفاظ اور جملے کہلوائیں، جن کی توقع کسی بازاری آدمی سے ہو سکتی ہے، یا کسی بچے کی زبان سے ایسی باتیں نقل کریں، جو ایک بدبراودنا شمنہ کے لئے سزا دہیں، تو اسے بلاغت نہیں کہا جائیگا،... یا مثلاً کسی شخص کو

جو ایک بات سے قطعی طور پر منکر ہے، سادہ اور معمولی الفاظ میں قائل کرنا، یا ایک ایسی بات کے لئے جس کو وہ پہلے ہی سے تسلیم کئے ہوئے ہے، اُس کے روبرو قسم کھا کر اسے یقین دلانا، شانِ بلاغت کے خلاف ہو گا؛ پس بلاغت کا کام ہر چیز اور ہر واقعہ کو اس کی اصلی حالت، اور پوزیشن پر ٹھیک ٹھیک قائم رکھنا ہے، اور پھر یہ ایک ایسا نازک اور دشوار کام ہے، کہ بڑے بڑے اہل قلم بھی یہاں ٹھوکر کھا جایا کرتے ہیں،

واقعات کا صحیح چربہ بھی نہیں اُتر سکتا، تا وقتیکہ الفاظ بھی ایسے موزون اختیار نہ کئے جائیں، جو اس خاص واقعہ یا حالت سے پورا پورا ربط رکھتے ہوں، شاعر کے سامنے بیان کرنے کے لئے مختلف اوقات میں مختلف مضامین ہٹا کرتے ہیں، لیکن جب تک ہر مضمون کی نوعیت کا لحاظ رکھتے ہوئے مناسب الفاظ استعمال میں نہ لائے جائیں، کلام میں نہ تاثر پیدا ہو سکتا ہے، اور نہ وہ بلاغت کے معیار پر پورا اُترتا ہے، پھر الفاظ کا صحیح اندازہ قائم کرنا بجائے خود ایک مستقل فن ہے، اور اس فن کے قواعد و ضوابط سراسر وجدان اور ذوقِ سلیم پر مبنی ہیں، بعض الفاظ تو صرف اپنی شکل و ہیئت ہی سے اپنے معانی کے مظہر ہو اُکرتے ہیں، بعض سے خوف و ہراس ٹپکتا ہے، کہ ان کے دیکھتے ہی انسان پر ہیبت چھا جاتی ہے بعض سے تعجب کا اظہار ہوتا ہے، اور بعض سے افسوس اور حسرت کا اسی طرح بعض سے مسرت اور بشاشت ٹپکتی ہے، کہ انہیں پڑھتے ہی رُوح کی تمام کلفتیں نائل ہو جاتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ غزل میں سادہ

شیریں، سہل اور لطیف الفاظ کا استعمال مستحسن سمجھا جاتا ہے، اور قصیدہ میں زوردار الفاظ کا؛ اسی طرح رزم، بزم، مدح و ذم، فخر و ادعا اور وعظ و پند وغیرہ میں ہر مضمون کے لئے مخصوص الفاظ ہیں، اور ان الفاظ کو احتیاط اور قرینے سے استعمال میں لانا ہی بلاغت میں ایک شان پیدا کرنا ہے!

مثال کے طور پر ”خیالستان“ مصنف سجاد حیدر کے یہ چند فقرات ہی لے لیجئے:-

- (۱) تیرا ایک ہوا چاک سرسراہٹ سے اس کی طرف گیا،
- (۲) اوہر سلسبیل مقرر اس کے بدن پر پڑ رہی تھی،
- (۳) بڑھا رواں بادلوں پر نظر گاڑ کر سوال کا جواب دیتا،
- (۴) اس آواز میں ایک عزم آہنیں کی قوت، ایک حکم عدالت کی ہمت
موجو و تھی،

- (۵) اس کے دل میں ایک طغیان غرور اُٹھا،
- (۶) جس کی ہیئت کدائی سے بوئے فحش کے بھپکے نکل رہے تھے،
- (۷) دو آنسو کے قطرے، دو قطرہ سعادت ڈھلک رہے تھے،
- (۸) ان سب چیزوں کو لرزش حیات دینے والی موم بقی تھی، جس سے
مختصر سی روشنی نکل رہی تھی،

- (۹) وہ شفقت و رقت، روحانیت و انسانیت کی دیوی ماں،
خط کشیدہ الفاظ کو ذرا غور سے ملاحظہ فرمائیے، ہر جگہ واقف اور حالت

کے مطابق جذبات اور کیفیات کا پورا پورا لحاظ رکھتے ہوئے الفاظ کو استعمال میں لایا گیا ہے، یہی وجہ ہے، کہ ہر فقرے کے ساتھ معانی کا لطیف احساس بھی فوراً انسان کی طبیعت پر چھا جاتا ہے !
 اُردو شعراء میں دیکھا جائے، تو میرا مجلس اس معاملہ میں سب سے زیادہ محتاط دکھائی دیتے ہیں، دیکھئے صبح کی تصویر کن الفاظ میں کھینچی ہے کہ ایک سماں آنکھوں کے سامنے بندھ جاتا ہے :-

طے کر چکا چونزل شب کاروانِ صبح ہونے لگا افاق سے ہوید انشانِ صبح
 گردل سو کوئچ کرنے لگے اخترانِ صبح ہر سو ہوئی بلند صدائے اذانِ صبح

پہناں نظر سے روئے شبِ تار ہو گیا

عالم تمام مطلع انوار ہو گیا

خوشید نے جو رخ سی اٹھائی نقاشِ شب در کھل گیا سحر کا ہوا بند بابِ شب
 انجم کی فرو فردوسی لے کر حسابِ شب دفتر کشائے صبح نے الٹی کتابِ شب

گردل پر رنگ چہرہ ہمتابِ نق ہوا

سلطانِ غوب و شرق کا نظم و نسق ہوا

یوں گلشنِ فلک مستاری ہوئی نہاں چُن لے چُن سے پھولوں کو جس طرح باغبان
 آئی بہار میں گل ہمتاب پر خزاں مہجاکے رہ گئے ثمر و شاخ کبکشاں

دکھلائے طور بادِ سحر نے سُوم کے

پڑ مرده ہو کے رہ گئے غنیہِ نجوم کے

چھپنا دہ ماہِ تاباں دُ صبح کا ظہور یا و خدا میں زمزمہ پر دواڑی طہور

وہ رونق اور وہ سر ہو، وہ فضا وہ نور، تنگی ہو جس سے چشم کو اور قلب کو سرد

انساں زمیں پہ جو ملک آسمان پر

جاری تھا ذکرِ قدرتِ حق ہر زبان پر

وہ سُرخِ شفق کی ادھر چرخ پہ بہار، وہ بار و درخت وہ صحرا وہ سبزہ ناز
شبِ نعم کے وہ گلوں پہ گہرائے آبدار، پھولوں سے سب بھرا ہوا دامنِ کوسا

نامے کھلے ہوئے وہ گلوں کے شمیم کے

آتے تھے سرد سرد وہ جھونکے نسیم کے

تھی دُشت کربلا کی زمیں شکرِ آسمان، تھا دور و دور تک شبِ جنتابِ سماں

چھٹکے ہوئے ستاروں کا زونپہ تھا گماں، ہر فزاتِ بیچ میں تھی مثلِ ہیکشاں

سرسبز جو درخت تھا وہ نخلِ طور تھا

صحرا کے ہر نہال کا سایہ بھی نور تھا

ایک اور جگہ :

پھولا شفق سے چرخ پہ جبِ نازِ صبح، گلوں اور شبِ خزاں ہوا آئی بہارِ صبح

کرنے لگا فلکِ نرا انجمِ نثارِ صبح، سرگرم ذکرِ حق ہوئے طاعتِ گزرا صبح

تھا چرخِ اخضر پہ یہ رنگِ آفتاب کا

کھلتا ہے پھول جیسے چین میں گلاب کا

چلنا وہ بادِ صبح کے جھونکوں کا دم بدم، مرقانِ باغ کی وہ خوش الحانیاں ہم

وہ آبِ تابِ نہر وہ موجوں کا پیچ و خم، سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا

تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا
 دُہ نورِ صبح اور دُہ صحرا دُہ سبزہ زار تھے طائرِ دل کے غول و فیتھوں پہ بیشمار
 چلنا نسیم صبح کا رہ رہ کے بار بار کو کو دہ قمریوں کی دہ طائوس کی پکا
 داتھے دریچے بارغِ بہشتِ نسیم کے
 ہر سو رواں تھے دشت میں جھونکے نسیم کے
 آمد دُہ آفتاب کی دُہ صبح کا سماں تھا جس کی ضو سے بعد میں طائوس سماں
 زروں کی روشنی پہ ستاروں کا تھا گال ہر فزات بیچ میں تھی مثلِ کہکشاں
 ہر نخل پر فیضائے سر کوہِ طور تھی
 گویا فلک سے بارشِ بارانِ نور تھی
 دُہ پھولنا شفق کا دُہ مینائے لاجورد نخل سی وہ گیا وہ گل سبز و سرخ و زرد
 رکھتی تھی پھونک کر قدم اپنا ہوا سرد یہ خوف تھا کہ دامنِ گل پر پڑے نہ گرد
 دہوتا تھا دل کے داغِ چمن لالہ زار کا
 سردی جگر کو دیتا تھا سبزہ کچھار کا
 یہ چونکہ صبح کی بہار کا ذکر تھا اس لئے شاعر نے پیرایہ بھی ایسا اختیار
 کیا ہے کہ پڑھنے سے طبیعت میں فرحت اور تازگی پیدا ہو، اسی طرح جو
 الفاظ اس ضمن میں لائے گئے ہیں، وہ بھی نہایت لطیف اور نرم و نازک الفاظ
 ہیں، کہ جوں جوں پڑھتے جاؤ، توں توں طبیعت کی افسردگی زائل ہوتی چلی
 جاتی ہے !
 آئیے کہ اب سکون و اطمینان کے ساتھ ہی ساتھ جذباتی دنیا کو بھی

ایک نظر دیکھ لیں، لڑائی کی تیاری ہے، صفیں آراستہ ہو چکی ہیں، گھوڑے
 آگے بڑھنے کے لئے مضطرب ہیں، اور تلواریں بے نیام ہو اچا ہتی ہیں؛
 نقارہ و غاپہ لگی چوٹ یک بیک اٹھا غریو کوس کہ بٹنے لگا فلک
 ہتھپور کی صدا سے ہراساں ہو ملک قنا پھنکی کہ گونج اٹھا دشت و تنک
 شورِ دہل سے حشر تھا فلک کے تلے
 مرنے بھی ڈر کے چوٹک پٹے خاک کے تلے
 گھوڑوں سے گونجتا تھا وہ سب دبی نبرد گردوں میں مثل شیشہ عسائی تھی گرد
 تھا چرخ چار میں پیرِ رخ آفتاب نرد در تھا گرے زمیں پہ نہ میناے لاجورد
 گرمی، ہجوم فوج سے وہ چند ہو گئی
 خاک اس قدر اڑی کہ ہوا بست ہو گئی
 کانپے طبق زمیں کے ہلا چرخ لاجورد مانند کبرا ہو اٹھی کا رنگ زرد
 اٹھ کر زمیں سے بیٹھ گئی زلزلہ میں گرد تینوں کی آنچ دیکھ کے بھاگی ہو اسر
 گرمی سے رن کی ہوش اڑے وحش و طیر کے
 شیر اس طرف اتر گئے دریا کو پیڑ کے
 اللہ سے زلزلہ اکر لڑنے تھو دشت در جنگل میں چھپو پھرتے تھو ڈر کے جانور
 جنات کانپ کانپ کے کہتے تھو الحذر دنیا میں خاک ٹپتی ہوا جایش ہم کدھر
 اندھیرے اٹھی برکت اب جہان سے
 لول گیا زمیں کا طبق آسمان سے
 غمراہ تھا خوف سی میناے لاجورد ہلتے تھے کوہ، کانپتا تھا ادائی نبرد

تھان بھی زرد ہو پ بھی زردا و زیں بھی نو خورشید چھپ گیا یہ اٹھی کر بلا میں گرد
 اک تیرگی غبار سے تھی چشم ہر میں
 ٹاپو پڑے ہوئے تھے محیط سپہر میں
 بھلا خوف و ہشت کی اس سے زیادہ موثر صورت اور کیا ہوگی، کہ
 مَر دے بھی ڈر کے چونک پڑے خاک کے تلے
 ع اور انتہا یہ ہے، کہ ع

شیر اس طرف اتر گئے دریا کو پیر کے
 اس کے بعد دو حریفوں کی معرکہ آرائی اور فنیوں جنگ کا ملاحظہ بھی فرما
 لیجئے :-

یہ کہہ کے اپنے چھوٹے سنی زری کو دی نکلا چمکی انی تو برق پکاری کہ "الاماں"
 اک بندیا بندھ کر جو فرس سے کہا کہ "ہاں" ڈانڈا آئی ڈانڈ پرتو سناں سو لڑی سناں
 بل کیا کرے کہ زود ہی موزی کا گھٹ گیا
 غل تھا کہ آڑ دھپے سے وہ افعی لپٹ گیا

بھنجلا کے چوب نیزہ کو لایا وہ فرق پر قاسم نے ڈانڈ ڈانڈ پہ مارا بچا کے سر
 دو انگلیوں میں نیزہ دشمن کو تھام کر جھٹکا دیا کہ جھٹک گئی گھوٹے کی بھی کر
 نیزہ بھی دب کے ٹوٹ گیا نابکار کا

دو انگلیوں سے کام لیا ذوالفقار کا

سنجھلا وہ بے شعور یہ جھٹکا اٹھا کہ جب قبضہ میں لی کمان کیانی بصد غضب
 چلے میں تیر جوڑ چکا جب وہ بے ادب تیر چڑھائے قاسم نوشاہ نے بھی تب

تیرنگاہ سے وہ خطا کار ڈر گیا
کانپے یہ دونوں ہاتھ کہ چلے اُتر گیا

ان اشعار میں اول سے لے کر آخر تک جتنے بھی الفاظ آئے ہیں، ان سب سے ہیبت و بدبہ اور خوف و ہراس ٹپکتا ہے، فقر و جلال کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے، اور خونِ رگوں کے اندر جوش مارنے لگتا ہے، اسی طرح جہاں غیظ و غضب کا اظہار فرماتے ہیں، تو لکھتے ہیں:

کم تھانہ ہمہ اسد کردگار سے نکلا ڈکارتا ہوا ضیغم کچھار سے
کیا جانے کس نے روک دیا ہے دلیر کو سب دشت گونجتا ہی یہ غصہ ہی شیر کو
اسی طرح جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، الفاظ ہی واقعہ نگاری کے
حق کو بھی صحیح طور پر ادا کیا کرتے ہیں، اس بنا پر میرزا و میر کا یہ مصرعہ
ملاحظہ فرمائیے: ع

فرمایا میں حسین علیہ السلام ہوں

یہ اس وقت کا ذکر ہے، جبکہ تمام ہمارے ساتھ چھوڑ چھوڑ کر نیک کی
طرف جا ملے ہیں، اور سوائے خدا کے کوئی بارود دگار باقی نہیں رہا، تو اس
اشنا میں ایک مسافروں سے گزرتا ہے، اور آپ کو پریشان حال دیکھ کر
نام دریافت کرتا ہے، میر انیس نے اسی واقعہ کو یوں ظاہر کیا ہے:
یہ تو نہیں کہا کہ شہ مشرقین ہوں مولانا نے سر جھکا کے کہا میں حسین ہوں
اب آپ ہی اندازہ فرمائیے، کہ بلاغت کے مقتضیات کو میر انیس نے

کس قدر ملحوظ رکھا ہے، اور دبیر کے ہاں یہ لوازمات کس حد تک مفقود ہیں،
 اول تو کوئی شخص جب وہ خود اپنا نام بتائے، اس پر کسی زائد چیز کا اضافہ ہی
 نہیں کیا کرتا ہے، اور پھر امام حسینؑ جیسی برگزیدہ ہستی، جس کا ذکر تیرہ سو
 سال گزر جانے پر بھی آج تک زندہ چلا آتا ہے، اور تا قیامت زندہ رہیگا
 اپنے لئے کسی زائد تشبیہ کی محتاج بھی کیونکر ہو سکتی تھی؛ بخلاف اس کے
 میرانیس نے واقعہ کا حق ادا کر دیا ہے، اول تو ادب کا جو تقاضا تھا، اس کو
 زیادہ سے زیادہ احترام کے ساتھ اپنے الفاظ میں یوں ادا کر دیا ع
 یہ تو نہیں کہا کہ شہِ مشرقین ہوں

پھر حالات کے نامساعد ہونے سے انسان کی جو کیفیت ممکن ہو سکتی ہے
 اُس کا نقشہ یوں کھینچ دیا ع

مولانا نے سر جھکا کے کہا میں حسین ہوں
 ”سر کا جھکانا“ بے بسی اور لاچارسی کو ظاہر کرتا ہے، جو حقیقت میں اس
 واقعہ کا زبردست ایکٹ ہے،

اسی طرح ایک اور مثال لے لیجئے :
 رُکشِ خدا کی نوح سے چھوٹے بڑے ہوئے سجادہ سوامن اٹھ کھڑے ہوئے
 میرانیس فرماتے ہیں :-

رُکشِ خدا کی نوح سے چھوٹے بڑے ہوئے تلواریں ٹیک ٹیک کے سب اٹھ کھڑے ہوئے
 ایک ہنگامہ خیز جنگ ہوئی والی ہے، لیکن میرزا دبیر اس کے لئے صرف
 امام حسین علیہ السلام کی تخصیص ظاہر کرتے ہیں، بخلاف اس کے جب میرانیس

کی باری آئی، تو انہوں نے فرمایا ع
 ”لو ایریں ٹیک ٹیک کے سب ٹکڑے ٹکڑے“

یہاں اپنے امام اور مقتداء کے لئے متبعین کی طرف سے نہ صرف سچی
 جاں نثاری کا اظہار کیا گیا ہے، بلکہ محاکات کی رو سے بھی دیکھئے، تو اس
 خاص منظر کو جس لطیف اور دل کش صورت میں پیش کیا گیا ہے، اسکی نظیر نہیں!
 پس معلوم ہوا، کہ بلاغت کے لئے واقعات کی صحیح اور سچی تصویر کھینچنا
 سب سے مقدم امر ہے، اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتا، جب
 تک کہ مضامین کی نوعیت کو بھی مد نظر رکھتے ہوئے الفاظ کا مناسب تیرہ
 دیا نہ کو لیا جائے، علامہ اقبال نے ایک جگہ اسی باب ایک نکتے کا
 حل فرمایا ہے، وہ کہتے ہیں :

مصاف زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر شہستانِ محبت میں حریر و پرنیاں بچھا
 گذر جانگے سیلِ تند رو کو وہ دیباچاں سے گلستاںِ اہ میں آئے تو جو غمخوار بچھا
 قوتِ انسانی کی یہی تقسیم اور نفسیات کے یہی باطنی خصائص ہیں، کہ
 جن کی بنا پر فردوسی سے بزم اور سعدی سے رزم کا حق ادا ہو سکا،
 میر تقی میر قصیدہ نہ کہہ سکے، اور ستوا سے غزل میں وہ سوز و اثر پیدا
 نہ ہوا، جو میر کے ہاں موجود ہے !

شعر کی ماہیت اس کے بعد یہاں شعر کی چند ضروری صفات بھی اجمالی
 طور پر آپ حضرات کے سامنے پیش کئے دیتا ہوں، ملکٹن کی رائے میں
 شعر کی خوبی یہ ہے کہ ”سادہ ہو، جوش سے بھرا ہوا ہو، اور اصلیت پر

”مٹی ہو“

تو گویا ملکن نے شعر کے لئے تین شرطیں قرار دی ہیں، اس میں کوئی شک نہیں، کہ ان میں سے ایک شرط یعنی شعر کا جوش اور اثر سے بھرا ہونا، بلا تامل قبول کر لینے کے لائق ہے، لیکن سادگی اور اصلیت میں ہیں کلام ہے، ہو سکتا ہے، کہ ایک شعر سادہ تو ہو، لیکن اُس میں جدت نہ پائی جائے، اسی طرح بالکل ممکن ہے کہ ایک شعر اصلیت پر تو مبنی ہو، لیکن رفعت تخیل اور جوش و اثر سے عاری ہو، مثال کے طور پر مومن کا یہ شعر ہی لے لیجئے، فرماتے ہیں:

بن چکی جدم حوادث کی کماں افلاک سے خاک کا تودہ بنا انساں کی مُشغیت سے
اس شعر کے الفاظ بھی بالکل سادہ ہیں، اور ترکیب میں حسی بھی پائی جاتی ہے، لیکن اس کے معنی زیادہ سے زیادہ یہ ہوں گے، کہ انسان ہمیشہ سے مَورِدِ آفات چلا آتا ہے، ظاہر ہے کہ اس مفہوم کے لئے پیرایہ بالکل معمولی اختیار کیا گیا ہے، جس میں ظاہر تعجب کی کوئی بات نہیں پائی جاتی، لیکن جب اسی مفہوم کو ایک اور شاعر نے ان الفاظ میں ادا کیا:
کسی تیغ جفا کی چرخ سوا امید نہسنے کی جو ہوئے بھی تو ہاں شاید دہان زخم خندان
تو اگرچہ بیان میں قدے تکلف ضرور پیدا ہو گیا، لیکن جدت اور مفوی لطائف کے علاوہ ”تا کید الذم بما یشبه المدح“ کی ایک بہترین مثال پیدا ہو گئی، حُسن بیان کی ایسی نادر مثالیں بہت کم دیکھنے میں آتی ہیں، اسی طرح غالب کا ایک شعر ہے:

تو دوست کسی کا بھی شکر نہ ہوا تھا اور وہ یہی دُہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا
محبوب سے کہتا ہے، کہ تیرے ظلم و ستم سے دُنیا میں کوئی بھی محفوظ نہیں ہے
اور تیری جفائیں دُن بدن بڑھتی چلی جاتی ہیں، ظاہر ہے، کہ اس شعر کے الفاظ
بالکل سادہ اور عام فہم ہیں، اسی طرح جو اسلوب اختیار کیا گیا ہے، اس
میں بھی کوئی ایسی خاص بات نہیں پائی جاتی، جس سے تعجب، اور تعجب کے ساتھ
طبیعت میں کشش پیدا ہو جائے، لیکن جب اسی مفہوم کو دوسرے الفاظ
میں اس طو پر ادا کیا گیا کہ :

ناوِک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانہ میں تھپے ہے مُرغِ قبلہ نما آشیانہ میں
تو اگرچہ الفاظ میں قدے اشکال ضرور پیدا ہو گیا، جس سے معنی مقصود
کے پالینے میں کچھ دیر کے لئے تاثر سے کام لینا پڑتا ہے، لیکن محض انداز
کی جدت نے مضمون کو کچھ سے کچھ بنا دیا، اور معانی میں ایک دل کش عنائی
پیدا ہو گئی ! تعمیم سے گزر کر جب شاعر نے ”مُرخِ قبلہ نما“ کو بھی اس
خوف و اضطراب میں شامل کر لیا، تو اس سے ”حسنِ تعلیل“ کی بھی ایک
نہایت اچھی مثال پیدا ہو گئی ! رٹلن کی دوسری شرط اصلیت ہے،
لیکن حق تو یہ ہے، کہ شاعری اور فکر و نظر کے وسیع میدان میں یہ بھی
ایک بے جا پابندی ہے، شاعری میں منطقی اصولوں کو تو کوئی دخل ہے
نہیں، شاعری جذباتِ باطنی، اور وارِ داتِ قلبی کی صحیح ترجمانی کا نام
ہے، پس ان حالات میں اگر ایک ایسی بات ظہور میں آ بھی جائے، جو اصلیت
کے عام قواعد پر پوری نہ اترتی ہو، تو یہ کوئی عیب کی بات نہیں ہے، بلکہ

اس کا شمار کلام کے معنوی محاسن میں ہوتا ہے، پھر یہ بھی ضروری نہیں، کہ جس شعر میں اصلیت پائی جائے، وہ اعلیٰ ہی درجے کا شعر ہو، اس سے زیادہ اور کو نہ شعر سچا ہو سکتا ہے :

چشمان تو زیرِ ابرو اند دندان تو جملہ دردِ دانت
اب شاعر نے یہاں کونسی بات خلاف واقعہ کہی ہے، حالانکہ اس کو ادنیٰ درجے کا شعر بھی بمشکل کہا جاسکتا ہے !

حسان بن ثابت شعر کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں :
وَإِنْ أَحْسَنَ بَيْتٍ أَنْتَ قَائِلُهُ بَيْتٌ يُقَالُ إِذَا انْشَدْتَهُ صَدَقَا
یعنی : ”اچھا شعر وہ ہے، کہ جب پڑھا جائے، تو لوگ بول اٹھیں، کہ سچ کہا۔“ لیکن ہمارے نزدیک اس باب میں سب سے عمدہ اور جامع قول ابنِ رشتیق کا ہے، وہ لکھتے ہیں :

فَإِذَا قِيلَ اطْمَعِ النَّاسَ طَرًّا وَإِذَا رِيمًا انْجَزَا الْمُبْجَزَيْنَا
یعنی : ”جب پڑھا جائے، تو ہر شخص کو یہ خیال ہو، کہ میں بھی ایسا کہہ سکتا ہوں، مگر جب ویسا کہنے کا ارادہ کیا جائے، تو معجز بیان عاجز ہو جائیں“ حق تو یہ ہے، کہ ابنِ رشتیق نے جس لطافت اور خوبی سے عمدہ شعر کی تعریف کی ہے، اس سے بہتر تصور میں نہیں آ سکتی، اور غور کیا جائے تو یہ تعریف اپنی جامعیت کے لحاظ سے ملٹن اور حسان کی بیان کردہ تعریف کو بھی حاوی ہے، ایک بلند پایہ اور اچھے شعر کے لئے ایسے ہی دجاذبین اور مؤثر الفاظ لائے چاہئیں، گویا :

دیکھنا تقریب کی لذت کہ جو اس نے کہا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے نہیں ہے۔
اس لحاظ سے شعر کی انتہائی خوبی یہ ہوگی، کہ جذبات و معانی کے لحاظ سے ایک بہترین شعر ہو، اسی قدر الفاظ بھی عمدہ اور دلنشین رکھتا ہو، پھر ساتھ ہی جب اسے نثر بنانا چاہیں، تو نہ بن سکے، شعراء کی اصطلاح میں ایسے کلام کو ”سہل متنع“ کہتے ہیں، مثال کے طور پر میر کا یہ شعر لے لیجئے :

اچکے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے وہاں کے چاک ڈگریاں کچھ چاک میں
نقل کیا گیا ہے، کہ مولانا آزاد وہ کے مکان پر جہاں مومن اور
شیفۃ بھی موجود تھے، یہ شعر پڑھا گیا، بے انتہا تعریف ہوئی، اور
سب کو یہ خیال ہوا، کہ اس قافیہ کو ہر شخص اپنے اپنے سلیقہ اور فکر
کے مطابق باندھ کر دکھائے، سب قلم و دوات اور کاغذ لے کر الگ الگ
بیٹھ گئے، اور فکر کرنے لگے، اُسی وقت ایک اور دوست وارد ہوئے
مولانا سے پوچھا، کہ حضرت کس فکر میں بیٹھے ہیں، مولانا نے کہا،
قل ہو اللہ کا جواب لکھ رہا ہوں،

اسی طرح میر خلیق کا ایک شعر ہے :

رُشک آئینہ ہے اس رُشک قمر کا پہلو صاف ادھر سے نظر آتا ہی ادھر کا پہلو

غالب کا یہ شعر بھی ایسا ہی بے ساختہ پن ظاہر کرتا ہے :

کہاتم نے کہ کیوں ہو غیر کے طنز میں سوائی بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ کیوں ہو
نثر بھی اس عمدگی اور صفائی سے ترتیب نہیں دی جاسکتی، جس سے کہ

مرزا نے اپنے شعر کو ترتیب دیا ہے ”میرٹھ والے بزرگ“، بھی ایک شعر اس ضمن میں لاثانی کہہ گئے ہیں، انکا فرمانا ہے :-

نامرد کے ماتھے میں پہنچ کر شمشیر نیام ہو گئی ہے

اس میں الفاظ کے اختصار اور بیان کی سادگی کو دیکھئے، پھر تشبیہ کی جدت اور ندرت کا بھی اندازہ کیجئے، اور پھر اس پر بھی غور کیجئے، کہ شاعر نے تلوار اور نیام کا ضلع اختیار کرتے ہوئے بھی کس خوبی سے ”جو امر دی“ اور ”بزدلی“ جیسی متضاد چیزوں کو انہی دو الفاظ سے ثابت کر کے دکھلا دیا ہے!

اسی کے برعکس جب کلام اپنی صحیح ترتیب پر قائم نہ ہو، تو اس کو ”تعقید لفظی“ کہتے ہیں، اور ایسی حالت میں اسے نثر بنانے کی ضرورت پیش آتی ہے، مثلاً غالب کا یہ شعر:

بیٹا اگر دل تمہیں دیتا کوئی دم چین کرتا جو نہ مر تا کوئی دم آہ و فغاں اور
یعنی ”اگر (میں) تمہیں اپنا دل نہ دیتا، تو کوئی دم اور چین کر لیتا، اور اگر (استقدر جلد) نہ مرتا، تو کوئی دم اور آہ و فغاں کرتا!“

اس عیب سے بھی ایک شاعر اور ادیب کو محتاط رہنا چاہیے، کیونکہ اس کا ہونا فصاحت اور روانی میں ایک بڑا خلل پیدا کر دیتا ہے،

”تعقید معنوی“ بھی اسی بحث کا ایک دوسرا پہلو ہے، اور یہ عیب اس وقت پیدا ہوتا ہے، جب شاعر اپنے مقصد کا اظہار اتنے قلیل اور ناکافی الفاظ میں کرے، کہ اس سے مفہوم کو خاطر خواہ طور پر سیری حاصل

نہ ہو سکے، چنانچہ اس پر بھی ایک مثال پیش کئے دیتا ہوں، ملاحظہ ہو،
 گلے کو باغ میں جانے نہ دینا کہ ناحق خونِ پروا لے گا ہوگا
 مطلب یہ ہے، کہ شہد کی مکھی باغ میں جائیگی، تو چھتے بندے گی، جن
 سے موم پیدا ہوگا، موم سے موم بتی بنے گی، جب وہ روشن ہوگی، تو پروا لے آ
 کر جانِ نثار کرنے لگیں گے، بیچا لے پروا تو اس سے بچانے کی سب
 سے اچھی تدبیر ہی ہے، کہ گلے کو باغ میں جانے ہی نہ دیا جائے، یہاں
 اتنی کڑیاں چھوڑ دی گئی ہیں، کہ سامع کا ذہن اُن کی دریافت سے قاصر
 رہتا ہے،

بعض دیگر شرطیں **شعر میں تخیل کا پایا جانا بھی ایک نہایت ضروری بات**
 ہے، تخیل کے بغیر شعرِ سست اور غیرِ موقع سا رہتا ہے، تخیل کیا ہے؟ —
 فکر و نظر کے ایک عام معیار سے گذر کر کائناتِ قدرت میں ہر اعلیٰ و ادنیٰ چیز
 کے حقیقی اسباب و عوامل کو دریافت کرنے کے بعد اُن سے بلند اور حکیمانہ
 نتائج پیدا کرنے کا نام تخیل ہے، اس کو بھی نفسیات ہی کا ایک جزو
 سمجھنا چاہیئے، لیکن یاد رہے، کہ وجدان اور ذوقِ سلیم کے ساتھ ہی ساتھ
 یہ چیز بھی وہی ہے، اور انسان کی ذاتی کوشش کو اس میں بہت کم
 دخل ہے؛

اِس سادتِ بزر و بارِ زو نیست تا نہ بخشہ خدائے بخشندہ
 لیکن اگر کوئی چیز تخیل کو فروغ دے سکتی ہے، تو وہ قدرت کے عجائبات
 کو ایک وسیع نظر سے مطالعہ کرنا ہے، اس لئے کہ جب بر و بحر میں

نئی نئی چیزیں انسان کے سامنے آئیں گی، تو لازمی طور پر فطرت کا وہ حجاب جو چیزوں کے حقائق و معارف اس پر ظاہر نہیں ہونے دیتا تھا، نظر کے سامنے سے اٹھ جائیگا، دل کے جذبات جو امتدادِ زمان سے مُردہ ہو چکے تھے، نئے سرے سے زندہ ہوں گے، اور اس طرح وہ اپنی باطنی شورش سے خود کو پاکیزہ اور بلند خیالات کی وسیع فضاؤں میں اڑتا ہوا پائیگا!

تخیل کے ساتھ کلام میں اثر کا ہونا بھی ایک نہایت ضروری امر ہے، لیکن جب تک انسان ”قال“ سے گذر کر سراپا حال نہ بن جائے، شعر میں بھی اثر کا پیدا ہونا ایک سودائے خام ہے، اس کے لئے سب سے بڑی ضرورت سوزِ باطن کی ہے، ورنہ محض ٹھنڈی اور پھپھسی باتوں میں کیا رکھا ہے، حضرت غالب بجا فرما گئے:

حسِ فروغِ شمع سخن دُور ہو اسد پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

یہاں مجھے بے اختیار سیدِ انشاء کی ایک غزل یاد آتی ہے، اور چونکہ ایسی حالت میں کہی گئی، جبکہ زمانہ کے انقلاب نے شاعر کی تمام شوخی اور بذلہ سنجی کو اپنے دستِ ستم سے خاک میں ملا دیا تھا، اس لئے ہر ہر لفظ سوز و اثر میں ڈوبا ہوا ایک نشتر ہے، کہ بے اختیار دل میں اتر چلا جاتا ہے، لہذا اس لازمہ شعر کو نمایاں کرنے کے لئے میں اسے یہاں نقل کئے دیتا ہوں، ملاحظہ ہو:

کمر بند ہے ہوئے چلنے کو یاں سب بے بیٹھیں بہت گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں
 نہ چھیرنے بہت باد بہاری آہ لگ اپنی تجھ کو کھیلیاں سو جی ہیں ہم بیزاری میں

تصور عرش پر ہو اور سر پہ پائے ساتی ہو
 بغض کچھ نہ دہن میں اس گھٹھی میں بیٹھے ہیں
 بس ان نقش پائے ہزاراں کوئے تمنایں
 نہیں اٹھنے کی طاقت کیا کریں پائیٹھے میں
 یہ اپنی چال کو فنا دگی سے اب پہرہ تک
 نظر آیا جہاں پر سایہ دیوار بیٹھے ہیں
 کہاں صبر تحمل آہ ننگ نام کیا شے ہے
 میاں روپیٹ کر ان سب کو ہم کیا بیٹھے ہیں
 بخیلوں کا عجب کچھ حال ہو اس دویں یارو
 جہاں پوچھو یہی کہتے ہیں ہم کیا بیٹھے ہیں
 بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشاء

غیبت ہے کہ ہم صورت یہاں دوچار بیٹھے ہیں
 اسی طرح منظر کھر بھی جو تیسرے دور کے ایک شاعر ہیں، چند اشعار نہایت
 پُر سوز کہہ گئے، جو اگرچہ اوپر والی غزل کو تو نہیں پہنچ سکتے، لیکن کہنے والے
 کی صداقت اور حسن انداز پر ضرور دلالت کرتے ہیں :

چلی اب گل کے ہاتھوں سے لٹا کر رزاں اپنا
 نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں کچھ نشاپنا
 یہ حسرت رہی کیا کیا مرنے سے زندگی کرتے
 اگر ہوتا چمن اپنا گل اپنا باغباں اپنا
 الم سیاں تلک رویں کہ آخر ہو گئیں سوا
 ڈبو یا ہائے آنکھوں ترشہ کا خاندان اپنا
 مرا جی جلتا ہی اس بلبل بکیں کی غربت
 کہ جس نے اسے پر گل کے چھوڑا اشیاء اپنا
 ... پھر کلام میں زور اور وید بہ و شوکت کا پایا جانا بھی ایک لازمی
 بات ہے، یہی چیز ہے، جو تخیل اور اثر دونوں کے لئے رُوح رواں کا کام
 دیتی ہے،

مثال کے طور پر آغا حشر کے یہ چند اشعار پڑھ جائیے، کہ سوز و اثر کے
 ساتھ ہی ساتھ زور و بیان میں بھی لاثانی ہیں :

آہ جاتی ہر فلک پر رحم لانے کے لئے بادلوں کا وید و راہ جانے کیلئے
 اے دُعا! ہاں عرض کرو عرش الہی تھاں کے لے خدا! اب پھیرے رُخ گردشِ اُسم کے
 صلہ تھی کل جن سوا ب دُہ برسرِ پکار میں وقت اور تقدیر دونوں درپے آزار میں
 دُھونڈتے ہیں اب مادہ اسویش غم کیلئے کر رہے ہیں زخمِ دل فریادِ مرہم کے لئے
 خلق کے راندے ہوئے دنیا کے ٹھکرائے ہوئے آئے ہیں اب تیرے دُپر ہاتھ پھیلانے کے لئے
 رحم کر اپنے زائینِ کرم کو بھول جا ہم تجھے بھولے ہیں لیکن تو نہ ہم کو بھول جا
 حق پرستوں کی اگر کسی تونے دلجوئی نہیں طعنہ دیں گے بُت کہ مسلم کا خدا کوئی نہیں

خواریں بدکار ہیں ڈوبے ہوئے ذلت میں ہیں
 کچھ بھی ہیں لیکن ترے محبوب کی اُمت میں ہیں

یاد رہے کہ اس جگہ دبذب و شوکت سے بھی زیادہ ضروری چیز شعر میں
 جمالِ معنوی کا ظہور ہے، جمالِ معنوی سے میسر ہی مراد انعکاس

(Reflection) ہے جس طرح دل کی مسرت انسان

کے بُشرے سے ظاہر ہوتی ہے، اور آنکھیں بے اختیار چمکنے لگتی ہیں، اسی

طرح معانی کا جلوہ بھی الفاظ کے اندر ایک تصویرِ جمالِ بن کے اُتر آنا چاہیے!

پھر جو چیز شاعر کے لئے ایک خاص امتیاز پیدا کرتی ہے، یا جس سے

دُہ بقائے دوام حاصل کرتا ہے، اجتہاد اور جدت کا مادہ ہے،

تقلید کسی قوم کی تہذیب یا لٹریچر کے لئے موت کا پیغام ہے، اگر کوئی قوم

صحیح معنوں میں اپنی زبان اور ادب کو زندہ رکھنا چاہتی ہے، تو اس

کے لئے از بس ضروری ہوگا، کہ اپنی آواز کو دُنیا میں بلند کرنے کے لئے

ایک دلاویز جدت سے کام لے، ایک شخص خواہ کتنا ہی بڑا انشاء پرداز کیوں نہ ہو، لیکن اگر وہ قوت تخلیق نہیں رکھتا ہے، تو اس کی بات کو بھی کوئی خاص اثر اور پائداری حاصل نہیں ہو سکتی، اس کے لئے اکبر مرحوم کیا خوب فرما گئے ہیں :

اور دل کی کہی ہوئی جو دہراتے ہیں وہ فولو گراف کی طرح گاتے ہیں
خود سوچ کے حب حال مضمون نکال انسان یوں نہیں ترقیاں پاتے ہیں
شاعر کو چاہیئے، کہ تشبیہات اور استعارات وغیرہ میں ہمیشہ جدت
اور تنوع کا رنگ نمایاں کرتا رہے، کہ اس سے بھی زبان کو بڑی وسعت حاصل
ہوتی ہے، ایک ہی کھانا، خواہ وہ کیسا ہی لذیذ اور عمدہ پکا ہوا کیوں نہ ہو،
اگر مدت تک متواتر اور مسلسل کھایا جائے، تو اس سے بھی طبیعت گریز
کرنے لگتی ہے، پس زبان کا معاملہ تو اس سے کہیں زیادہ لطیف اور
نازک معاملہ ہے، لیکن اس سے یہ ہرگز نہ سمجھ لینا چاہیئے، کہ جو
خیالات اور اصطلاحات یا تشبیہات و استعارات وغیرہ متقدمین نے
وضع کئے ہیں، ان سے کسی قسم کا استفادہ ہی نہ کیا جائے، بلکہ اگر اصلاح
تحسین کی گنجائش ہو، تو اس سے زیادہ مبارک کام اور کوئی نہیں ہو سکتا :
شاہد معنی کہ باشد جامہ لفظش کہن نکتہ دانے گر حریر تازہ پوشاند خوش ست
قدرت کے کارخانے میں کمی اب بھی کسی چیز کی نہیں ہے، فقط دماغ
کے اندر الہامی خواص کا ہونا ضروری ہے، مولانا جامی فرماتے ہیں :
ہنوز آل ابر رحمت در فنا نست خم و خمیانہ باہر و نشانست

ابتدال بھی اُسی وقت تک ابتدال ہے، جب تک کہ اسے غور و فکر کے معمولی حلقوں ہی تک محدود رکھا جائے، اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے، کہ تشبیہ تو نہایت مبتذل اور پامال سی ہوتی ہے، لیکن محض اندازِ بیان کی خوش اسلوبی سے شعر میں لطافت اور جدت پیدا ہو جاتی ہے، مثال کے طور پر اس شعر سی کو لے لیجئے :

ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشق و لکیر کو کیسے تیر انداز ہو سید لا تو کہ لو تیر کو
محبوب کی نظر کو اکثر شعراء تیر و پیکان سے تشبیہ دیتے چلے آئے ہیں،
اس لئے بظاہر یہ کوئی نئی بات نہ تھی، لیکن اس شعر میں محض انداز کی خوبی
نے معانی میں ایک نزاکت اور دل کشی پیدا کر دی ہے، آتش نے بھی اسی
مفہوم کو بالفاظِ دیگر ادا کیا ہے :

ترچھی نظر سے طائرِ دل پوچھا شکار جب تیر کج پڑیگا اڑیگا نشانہ کیا؟
اور اسی طرح آنکھ کو بھی اس کی مستی اور رخسار کی بنا پر عموماً ساغر سے
تشبیہ دیتے چلے آئے ہیں، لیکن سودا نے اسی مفہوم کو جدت کا رنگ
دیکر اس طور پر ادا کیا :

کیفیتِ چشم اُس کی بھویا د ہے سودا ساغر کو مرے ہاتھ سے لیجو کہ چلا میں
”چلا میں“ کس بے ساختگی اور حُسن سے مستعمل ہوا ہے، گویا یہی دو الفاظ
ہیں، جنہوں نے شعر میں ایک ڈرامے کا ساز لگین اور خوشنما منظر پیدا کر دیا،
یہ فارسی میں ”از کارِ شدن“ کا نہایت عمدہ اور بھیمٹہ ترجمہ ہے، اس پر مجھے
نظیر سی کا ایک شعر یاد آیا، فرماتے ہیں :

بوئے یارین ازین سست دفائی آئد کلم از دست بگیرد کہ از کار بندم
اب سودا کا شعر بجائے خود ایک کارنامہ تھا، لیکن اسپر ایک اور
حضرت اسٹھے، تو انہوں نے معافی میں ادربھی دلکشی اور نزاکت پیدا کر دی
اور اس طور پر گویا ہوئے :

ہم نے دیکھی ہو کسی شوخ کی سستی بھری آنکھ ملتی جلتی تھی چھلکتے ہوئے پیمانے سے
ذرا غور تو فرمائیے، کہ صرف ”پیمانہ“ ہی نہیں، بلکہ ”چھلکتا ہوا پیمانہ“ جو سستی
میں بھی ایک طلاطم پیدا کئے دیتا ہے، یہ حُسن کی بے نیازی ہے، جس کے
باطنی جذبات آنکھوں میں نشے کی سی کیفیت لے آتے ہیں !
یا مثلاً محبوب کے رخسار کو شمع اور پھول وغیرہ سے اکثر تعبیر کرتے
چلے آئے ہیں، لیکن ذیل کی مثالوں میں انہیں چیزوں کو ملاحظہ فرمائیے،
و آع کا ایک شعر ہے :

رُخ روشن کے آگے شمع رکھو یہ کہتے ہیں اُدھر جاتا ہو دیکھیں یا اُدھر پردہ آتا ہو
محبوب کی شوخی اور رعنائی بیان کرنے کے لئے اس سے بہتر اسلوب
بھلا اور کیا ہوگا، گویا وہ اپنے پر تو حُسن اور کششِ رخسار پر اتنا اعتماد کئے
ہوئے ہے، کہ شمع سے بھی اسپر ضد باندھ لی ہے، اور جانتا ہے، کہ پروانہ
شمع کو چھوڑ کر اسی طرف آئیگا،

اسی طرح ایک اور شاعر کہتا ہے :

برابری کا تری گل نے جب خیال کیا صبا نے مار تھیرا منہ اسکا لال کیا
زلف کی تشبیہ ملاحظہ ہو :

خیالِ زلفِ تہاں میں نصیر پٹیا کر گیا ہے سانپ نکل اب لیکر پٹیا کر
 شعراء تو کیا اکثر صوفیاء بھی انسان کے دل کو کعبہ سے تعمیر کرتے
 چلے آئے ہیں، اور اس کا دکھانا گناہ کبیرہ سمجھا جاتا ہے، یہ بظاہر کوئی
 نئی بات نہ تھی، لیکن سو دوائے یہاں بھی ایک دلاویز جدت سے
 کام لیتے ہوئے اس خیال کو یوں ادا کیا:
 کعبہ اگرچہ ٹوٹا تو کیا جائے غم ہی شیخ یہ قصرِ دل نہیں کہ بنایا نہ جائیگا،
 پس معلوم ہوا، کہ مضمون اگرچہ مبتذل ہی کیوں نہ ہو، لیکن قادرِ الکلام
 شاعر اس میں بھی اپنے تصرف اور حسن بیان سے ایک شان پیدا
 کر دیتا ہے،

اس ضمن میں ایک چیز خاص طور پر عرض کر دینا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ
 جہاں ایک اچھی اور خوشگوار شے کا ذکر کیا جائے، وہاں تشبیہ بھی
 اس کے لئے ویسی ہی خوشگوار، اور دلخوش کن لینی چاہیئے، اسی طرح
 جہاں کسی مکروہ اور ناخوشگوار شے کا ذکر ہو، تو تشبیہ میں بھی اس کی
 مماثلت کو پورے طور پر لحاظ رکھنا چاہیئے، اعلیٰ سٹے کی تشبیہ ادنیٰ
 شے سے، اور ناقص چیز کی تشبیہ کامل چیز سے، ہمیشہ باطل اور غیر مفید
 ثابت ہوتی ہے، ایسا کرنے سے جہاں ”وجہ تشبیہ“ کو ضعف پہنچتا ہے، وہاں
 ”غرض تشبیہ“ بھی لازمی طور پر فوت ہو جاتی ہے، میں اس کتاب میں آگے
 چل کر غالب کے تاثرات میں اس حقیقت کو تفصیل سے واضح کر دوں گا
 سرِ دست میسر انیس کے دو ایک شعر ملاحظہ ہوں، فرماتے ہیں:

یوں برجھیاں تھیں چار طرف اُس خاکِ جیسے کرن لکھتی ہے گرد آفتاب کے
حضرت عباسؓ بن جیسی برگزیدہ ہستی کے لئے شاعر تشبیہ بھی دیسی ہی
عمدہ اور کامل لایا ہے، جیسی کہ زیادہ سے زیادہ ممکن ہو سکتی تھی، اسی طرح،
گردیں بارہ امیرِ دل کی ہیں و ایک سن جس طرح رشتہ گلدستہ میں گہلے چمن
نظارہ ہے، کیہاں بھی اہل بیت کے بیگناہ اور مظلوم لوگوں کے لئے تشبیہ
نہایت عمدہ اور اورنادر لائی گئی ہے، جس سے طبیعت کو قدرتی طور پر فرحت
اور سُرد حاصل ہو،

اسی طرح: ع

پتے بھی مثل چہرہ مدقوق زرد تھے

گرمی کی شدت کا اظہار اس سے اچھے پیرائے میں اور کیا ہو سکتا ہے
کہ پتوں کو بھی چہرہ مدقوق سے تعبیر کیا جائے، یہ حسن تشبیہ کے انتہائی
کمالات ہیں!

اس کے بعد ضروری ہے، کہ شعر میں سُو قیامہ الفاظ و محاورات

سے بھی اجتناب کیا جائے، اور نہ ہی ایسی باتوں کا ذکر ہو، جن سے
سُو سائٹی کے اخلاق پر بُرا اثر پڑتا ہے!

حشو بھی کلام کی بلاغت کو زائل کر دینے والی چیز ہے، لہذا اس سے

بھی حتی الوسع مجتنب رہنا چاہیے، حشو جیسا کہ معلوم ہے، لغت میں

اس بھرتی کو کہتے ہیں، جو تکیوں کے اندر دی جاتی ہے، اصطلاح شعری

میں جو الفاظ ضرورت سے زیادہ استعمال کئے جائیں، حشو کہلاتے ہیں،

ائمہ فن نے بظاہر جو اس کی تقسیم کی ہے، یعنی حشو مفسد، اور غیر مفسد اور پھر غیر مفسد کی بھی تین مختلف صورتیں، یعنی قبح، متوسط، اور بلع، یہ تکلف سے کسی طرح بھی خالی نہیں ہے، زائد اور غیر ضروری طوالت کسی حالت میں بھی مستحسن نہیں سمجھی جاسکتی، یہی وجہ ہے، کہ مستند اور بلند پایہ شاعر ہمیشہ سے اس معاملہ میں محتاط چلے آئے ہیں!

آمد اور آورد میں فرق آمد اصطلاح شعری میں وہ کلام ہے، جو

شاعر کی طبع سے بلا تکلف خود بخود ٹپک پڑا ہو، ایسے کلام میں روانی، اثر اور بے ساختگی اکثر پائی جاتی ہے، اور دل کش بھی ہوتا ہے، اسید طرح آورد اس کلام کو کہتے ہیں، جو تکلف سے طبیعت پر دباؤ دیکر پیدا کیا جائے، ایسے شعر میں کوئی خوبی نہیں ہوتی، بلکہ شاعر کی سستی طبع اور افتاد کا پتہ دیتا ہے، انسانی طبیعت کی ان دو مختلف کیفیتوں کو ان الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں، کہ جو شیرہ انگور سے خود بخود ٹپکتا ہے، وہ اس شیرہ سے زیادہ لطیف و بامزہ ہوتا ہے، جو انگور سے نچوڑ کر نکالا جائے،

سچ پوچھو تو یہ بھی انسان کے باطنی کو اُلف کا ایک مد و جزر ہے، کبھی تو سمند طبع کے لئے ایک معمولی سا تازیانہ ہی سبب کاروں برس کی جولانیوں کا کام دے جاتا ہے، اور کبھی انتہائی کشش۔ سے بھی کوئی مؤثر بات پیدا نہیں ہوتی، (Baudelaire)

فلسفہ جذبات کے اسی دقیق و لطیف نکتے کا ل کرتے ہوئے اپنے

الفاظ میں لکھتا ہے، کہ: ”شاعرانہ کیفیت میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے، جب تمام حواس نہایت درجہ تاثرات پذیر اور ذکی محسوس ہو جاتے ہیں۔ آنکھیں پردہ ابد تک دیکھنے لگتی ہیں، پر شور مقامات میں خفیف سے خفیف آواز کو کان سننے لگتے ہیں، اور شور سے بالکل نا آشنا رہتے ہیں۔ اختلال خیالات واقع ہوتا ہے، اور جلد اشیائے عالم اپنی صورت سے بسا اوقات دوسری صورتوں میں منقلب ہو جاتی ہیں، اور خیالات میں ناقابل حل اطلاقی تغیر پیدا ہو جاتا ہے، آوازیں رنگین معلوم ہونے لگتی ہیں، اور رنگ میں نغمہ پیدا ہوتا ہے۔“

علامہ اقبال بھی اسی حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

می شود پردہ چشم پر کا ہے گاہے دیدہ ام ہر دو جہاں را بے نگاہے گلے
 وادی عشق بے دور و دراز است و طے شود جادہ صد سالہ یہ آہے گلے

سعدی:

گے بر طایم اعلیٰ نشینم گے بر پشتِ پائے خود نہ بینم
 غالب بھی اسے تسلیم کرتا ہے، اور کہتا ہے:

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی چمن رنگار ہے آئینہ باد بہاری کا
 یعنی جب تک طبیعت کے اندر ضیق اور تنگی پیدا نہ ہو، لطافت اور روانی کی توقع رکھنا بھی بالکل بے سود ہے، جب شاعر کی طبیعت پر یہ انقباض طاری ہو، تو اُسے چاہیئے کہ جی بھر کر غسل کرے، اور کھلی ہوا میں سبزہ دیہار کی سیر و تفریح کیلئے جہاں بھی مناسب سمجھے نکل جائے،

حقیقت کہ اس عمل سے اس کی افسردگی اور کلفت نرمل ہو، اور وہ دوبارہ اپنی طبیعت کو فکرِ شعر کے لئے آمادہ و تیار پائے !

یہ چند ایسی باتیں تھیں، جو شعر و شاعری کے صحیح تعارف کو ملحوظ رکھتے ہوئے زیرِ قلم لائی گئیں، اور جن کا جاننا اہل ذوق حضرات کے لئے از بس ضروری تھا، اب ہم انہیں خصوصیات کی روشنی میں غالب کی شاعری اور اس کی اجہتاوی قابلیت پر کسی قدر تفصیل سے بحث کریں گے، اس ضمن میں ہر مضمون کے لئے ایک مناسب عنوان تجویز کر دیا گیا ہے، تاکہ اشعار کی ترتیب و تسنیق میں ناظرین کو کسی طرح کی دقت پیش نہ آئے؛ دورانِ بحث میں بعض اشعار مکرر بھی آئیں گے، لیکن ہر جگہ ان پر ایک جگہ اگانہ حیثیت سے نظر کی گئی ہے جس سے مضامین کے تنوع میں بجائے خود کوئی خلل پیدا نہیں ہوتا ❖

باب دوم^(۲)

مرزا کی شاعری

گر شعر سخن بہ دہرائیں بُودے دیوانِ مرا شہرتِ پرویں بُودے
غالب اگر ایں فنِ سخن دیں بُودے آں دین را نزدی کتابیں بُودے

عشقیت غالب کی عشقیہ شاعری اپنے اندر کچھ ایسی خصوصیات لئے ہوئے ہے، کہ وہ ادروں کے ہاں دیکھنے میں نہیں آتیں، حسنِ و عشق کے لطیف اور وجدانی تاثرات کو باتوں ہی باتوں میں یوں ادا کرتے ہیں، کہ گویا یہ بھی روزمرہ کی ایک معمولی سی عادت تھی، اول تو دیکھئے، کہ عشق کی شان میں کس انداز سے گوہر افشائی فرماتے ہیں :

رونقِ ہستی ہو عشقِ خانہ دیراں سانسے انجمن بے شمع ہو کہ برقِ فرس میں نہیں
مدعا اس شعر کا یہ ہے، کہ دنیا کی رونق اور زندگی کا لطف عشق ہی کے احساس سے ہے، اور اگر یہ نہ ہوتا، تو ہر جگہ دیرانی ہی دیرانی تھی، گویا مرزا بھی **شیئلے** کی طرح عشق کو ہستی و احوال کرتے ہیں، جس کا تسلسل فی المحقیقت زندگی اور کائنات کا تسلسل ہے، شعراے فرنگ میں سے شیئلے ہی ایک ایسا شاعر ہے، جسے میں نے انداز کی خوبی، محاسنِ اوستہ

کا پُورا پُورا التزام، جدت آفرینی، تخیل کی وسعت، موسیقی اور شاعرانہ کمالات کے ساتھ ہی ساتھ فلسفیانہ طرزِ بیان میں بھی مرزا سے بہت کچھ مماثل پایا، چنانچہ وہ بھی ”فلسفہ محبت“ میں عشق کے اسی عالمگیر قانون کو رُس خوبی سے ادا کرتا ہے، اور کن کن مناسبات سے فطرتِ انسانی کے اس گہرے احساس کی ترجمانی کرتا ہے، ملاحظہ ہو:

”چشموں کا پانی ایک عجیب رقت سے، ایک نہ سنبھل سکے دِلے اضطراب سے بہتا ہے“ اور دُڑتا ہوا اٹھو کریں کھاتا ہوا بالآخر دریا میں آن ملتا ہے پھر دریا بھی بجائے خود چین نہیں لیتا، تا وقتیکہ اپنے کو ایک سحرناپید کنار کے سپرد نہ کر لے، ہوا میں ایک لطیف اور شیریں احساس کے ماتحت ایک دوسرے میں جذب ہوئی جاتی ہیں، قری بھی اپنی گردن میں محبت کا طوق پہنے ہوئے ہے، اور لالہ بھی اپنے جگر میں عشق کا داغ رکھتا ہے، — الفرض دنیا میں کوئی شے بھی ایسی نہیں، جو یکہ دہنا ہو، کائنات کا ذرہ ذرہ ایک آسمانی قانون کی خوشی منانے کے لئے، اور ایک فطری ضرورت کی تعمیل میں ایک دوسرے کے اندر محو ہو گیا ہے، پھر کیا وجہ، اور نفاذ کیش محبوب، پھر کیا وجہ ہے، کہ تو مجھے اپنے دھال سے لذت یاب ہونی کا موقع نہیں دیتا؟ آہ! کیا کہوں، اور کس سے عرض کرؤں:

فلک دُور رکھ اس مجھ کو میں ہی نہیں دراز دیتی قاتل کے امتحاں کے لئے دیکھ، خدا را آنکھیں کھول کر دیکھ، اور انصاف کو کام میں لا، پہاڑوں کی چوٹیاں، یہ مغرور و سرکش چوٹیاں، آسمانی بلندیوں کو بوسہ دے رہی ہیں

— اگرچہ یہ گستاخی ہی تھی! 'موجیں ایک دوسری کو آغوش میں لئے ہوئے ہیں' — اگرچہ اس کو شوخی ہی کیوں نہ کہا جائے! 'بلبل شاخ گلبن پر بیٹھی ہوئی چھپا رہی ہے' — اگرچہ اس کو بے ادبی ہی سے کیوں نہ تعبیر کریں! — لیکن ہے تو سب عشق ہی کی بیخودی نا؟ پھر الزام کیسا اور شکاوت کیوں؟ ہم کہہ لیں گے:

ہے دُہی بستی ہرزہ کا خود غدِ رخواہ جس کے جلوہ سے زمین ما آسمان سرشار
ایک پھول جو اپنی نوع سے پیار نہ رکھے، کبھی غفوکے قابل نہیں ہو سکتا
آہ! تو نے کبھی غور بھی کیا، کہ آفتاب کی شعائیں زمین کو کس لئے اپنی
آغوش میں لئے ہوئے ہیں، اور مانتاب کی کرنیں کیوں سطحِ سمندر کو
جو جو ملتی ہیں؟ خبر یہ سب کچھ بولنے دو، اور ہر شے کو اپنی ہم جنس
شے سے جی بھر کر محبت کر لینے دو، لیکن اگر میرا معشوق مجھے نہیں چاہتا ہے
اور اپنے لبِ لعلین تک رسائی کی اجازت نہیں دیتا، تو یہ تمام چیزیں
میرے کس کام کی؟" ۷۱

پھر اقبال کا نظریہ بھی محبت کی اسی شورش انگیز مگر خاموش دھڑ

۷۲ ناسخ کا ایک شعر ہے :

عش میں جدِ ادب تو آگے رہتا ہو قدم شاخ گلبن پر سے بلبل کو اڑایا چاہیئے
۷۳ اس بیان میں جن اشعار کا از خود اضافہ کیا گیا، وہ محض شاعر کے
جذبات و احساسات کی صحیح ترجمانی کو ملحوظ رکھ کر استعمال میں لائے گئے ہیں، انہیں
کو غارج کر کے دیکھ لو، مضمون کا لطف آدھا بھی باقی نہیں رہتا ۱۲

وحدت کا مؤید ہے، چنانچہ :

یہ صدق قمری بلبل فریب گوش ہے باطن ہنگامہ آبا و جہنِ خاموش ہے
یہ عشق کی ابتدائی تشریح تھی، جس کا یہاں ذکر ہوا، اور جسے شاید
فردوس معانی میں اور خود اسی کتاب میں کسی دوسرے مقام پر اس سے
بھی زیادہ تفصیل کے ساتھ پیش کیا جائے، لیکن سر دست اتنے ہی پر
اکتفا کرتے ہوئے ہم اس ضمن میں مرزا کے کلام پر بحث کرتے ہیں،
عشق کے وجدانی احساسات کو روزمرہ کو الف کے مطابق پیش کرنا
مرزا کا خاص کمال ہے، اردو شاعری میں جہرأت کو ”معاملہ بندی“ کا
استاد تسلیم کیا جاتا ہے، لیکن غالب بھی جہاں ایسے راز و نیاز پر اُتر
آتے ہیں، تو ہر دوسری چیز ان کے مقابلے میں پھینکی اور بے مزہ سی معلوم
ہونے لگتی ہے، مثلاً :

لاکھوں لگاؤ ایک چرنا زگاہ کا لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں
اردو تو کیا فارسی کی عشقیہ شاعری میں بھی ایسی عمدہ مثالیں
ڈھونڈے سے کہیں دستیاب نہیں ہوتیں، اسی طرح ایک اور جگہ فرماتے
ہیں :

وہ نگاہیں کسوں ہوئی جاتی میں یارب لکپار جو مری کوتاہی قیمتِ مژگاں ہو گئیں
ایک تعجبِ خیز حسرت سے کہتا ہے، کہ محبوب نے آنکھ بھر کر تو مجھے دیکھا
نہیں تھا، لیکن یہ کیا معاملہ ہے، کہ اس کی نظریں میرے دل کے پار
ہوئی جاتی ہیں، گویا :

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی وہ اک نگہ بظاہر نگاہ سے کم ہے
شوق و اضطراب کی ایسی تضاد کیفیتیں بہت کم دیکھنے میں آئی
ہونگی، اسی طرح ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

میں سادہ دل آزدگی یا سرخوشی ہیں یعنی سبق شوق مکرر نہ ہوا غفلت
مطالب یہ ہے، کہ محبوب اگرچہ ہم سے خفا ہے، لیکن یہ بھی تو غنیمت
ہے، کہ امتدادِ زمان سے جذبہٴ عشق نے جو افسردگی کی صورت اختیار کر لی
تھی، وہ اس تشویش اور اضطراب کی حالت میں نئے سرے سے زندہ ہوگا
اور ذوقِ طلب میں زندگی کی ایک نئی شان پیدا ہو جائیگی، یہ بھی حسنِ عشق
کی ایک وجدانی کیفیت تھی، جسے مرزا نے نفسیاتی قوانین کے ماتحت
اس خوبصورتی سے الفاظ کا جامہ پہنایا ہے، اسی طرح کون نہیں جانتا،
کہ حسن و عشق کے معاملات میں رقابت ایک نہایت ہی ناخوشگوار اور
بیق منظر کا نام ہے، لیکن مرزا نے اس عام نظریے سے بھی استثناء
کی صورت پیدا کر کے اس موضوع پر ایک بالکل نئی چیز کا اضافہ کیا،
فرماتے ہیں :

سب قبیل سے ہوں ناخوش پر زبانِ مصرے، یوزلیخا خوش کہ عوامہ کناں ہو گئیں
صرف اسی حد تک محدود نہیں، بلکہ مرزا اپنے رنگ میں نہایت دلکش
اور لطیف انداز کے ساتھ ان مضامین میں ایک ایسی موسیقی اور ترنم بھی پیدا
کر دیا کرتے ہیں، جو خاص انہیں کا حصہ ہے، مثلاً :

نیند اُسکی، ہر دماغ اسکا ہر تہل اُسکی ہیں تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشان ہو گئیں

یہاں مجبُوب کے وصال ہی میں زندگی کی تمام راحتوں کو جمع کر دیا گیا ہے، اسی طرح :

مُجْت میں نہیں ہر فرق مرنے اور جینے کا اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کا فریہ دم نکلے
سبحان اللہ! موت و حیات جیسی دو متضاد باتوں کو کس حسن انداز سے
ایک کر دکھایا ہے، محاورہ کی خوبی معافی کی لطافت میں جذب ہوئی جاتی ہے!
پھر کہتے ہیں :

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہر مُنہ پر ذوق وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے
کتنا لطیف احساس ہے، اور کس قدر پاکیزہ خیال! عاشق اور معشوق
کے راز و نیاز کو ظاہر کرتی ہوئی اس سے زیادہ سچی اور موثر کیفیت اور کیا
ہو سکتی ہے، یہ شعر صداقت اور واقعیت کا ایک ایسا دلکش پیکر ہے،
کہ اس کے نقوش فطرت انسانی کے لطیف سے لطیف تاثرات کو بھی
اپنے اندر محصور کئے ہوئے ہیں، انسانی جذبات کی نفسیاتی تحقیق،
اس سے بہتر ممکن نہیں!

اسی طرح :

پیش طرز دلبری کیجئے کیا کہ بن کہو اُس کے ہر اک اشارہ سے نکلے یہ ادا کہ بول
فرماتے ہیں، کہ مجبُوب سے دل اڑالینے کا طریقہ دریافت کرنا بھلا
کونسی ضروری چیز ہے، اس کی تو ہر ادا اور ہر غمزہ از خود بتلائے دیتا ہے
کہ ہم اس طرح دلوں پر قبضہ جمالیا کرتے ہیں، اور اس سادگی و پرکاری
کی انتہا یہ ہے، کہ اس کی عبادت بھی اپنے اندر جفا کاری اور ظلم و ستم

کا ایک انداز لیٹے ہوئے ہے :

شمار سچہ مرغوب بے شکل پسند آیا تماشا خٹے بیک کف بردن دل پسندیا
حق تو یہ ہے، کہ اس باب میں نظیر میری نے جو کچھ کہا، اُسے حسن بیان
اور بلاغت کا انتہائی کمال کہا چاہیئے، چنانچہ:

زفر قناد مشہر کجا کہ مے نگرم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جانیجا
یہ دلبری کچھ زالی شان کی دلبری ہے، دُنیا ئے شعر میں اس کی
مثال نہیں، محبوب کا سراپا بیان کیا ہے، لیکن اس رنگینی سے کہ مصوّر
کے سینکڑوں کارنامے اور حسن و عشق کی بیسیوں داستانیں اس پر سے
تربان کی جا سکتی ہیں، جن لوگوں نے اس تاثر کو دیکھا، اور سمجھا ہے،
وہی اس کی شوکت کا صحیح اندازہ بھی کر سکتے ہیں،

میر نے بھی اس کا ترجمہ کیا تو سہی، لیکن وہ شوخی اور رعنائی پیدا
نہ ہو سکی، جو اصل شعر میں ہے، چنانچہ کہتے ہیں :

جس حائے سراپا میں نظر جاتی ہو اسکے آتا ہے مے جی میں ہیں عمر بسر ہو
پھر ذرا تعمق سے کام لیا جائے، تو معلوم ہوگا، کہ مرزا کی عشقیہ
شاعری کا ماہہ الامتیا ز زیادہ تر رشک کا مضمون ہے، ایسی
مثالیں ان کے ہاں بکثرت ملیں گی، لیکن جہاں بھی اس خیال کو ادا کیا
ہے، جدت کا پہلو کہیں بھی فوت ہونے نہیں پایا، مثلاً :

بدگمانی نے نہ چاہا مے سرگرم خرام رخ پہ قطرہ عرق دیدہ حیراں سمجھا
فرماتے ہیں، کہ میں دوست کے باسے میں اس قدر بدگمان ہوں، کہ اس کا

سرگرم خرام ہونا بھی مجھے گوارا نہیں، اس لئے کہ چلنے سے پسینے کے جو قطرات اس نازنین کے چہرہ پر نمایاں ہوں گے، ان پر بھی مجھے غیر کی اُن آنکھوں کا اشتباہ ہوتا ہے، جو اس کی شوخیِ حسن کو دیکھ کر فرطِ حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئی ہوں، اپنے رشک کو اس انداز سے ظاہر کرنا حسنِ بیان کی انتہا ہے، اسی طرح جو تشبیہ اس ضمن میں لائی گئی ہے، وہ بھی اپنی نظیر نہیں رکھتی، ”قطرہ عرق کو ”دیدہ حیران“ سے تعبیر کرنا شعریت اور نزاکت کا انتہائی کمال ہے،

اس حد تک تو رشک کا تعلق محض رخسار اور چہرے سے تھا، لیکن ایک بات اس سے بھی بڑھ کر پیدا کی جاسکتی تھی سو اس کا اظہار مرزا نے اس طور پر کیا :

ابھرا بؤا نقاب میں ہوائے یک تار مرزا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو
یعنی جستجوئے شوق میں رقیب کی نگاہیں تو کہیں نقاب کے اندر الجھ کر نہیں رہ گئیں؟ گویا :

تکلف بظرفِ نظارگی میں بھی ہسی لیکن وہ دیکھا جاکتے ظالم دیکھا جائے مجھ سے
کہتے ہیں کہ محبوب تک رسائی حاصل کر لینا تو ایک بڑی چیز ہے میں تو اتنا بھی گوارا نہیں کر سکتا، کہ اسے کوئی آنکھ بھر کر دیکھ ہی لے، غیر تو غیر سیاں خود کو بھی اس معاملہ میں معذور تصور کرتے ہوئے فرماتے ہیں :
دیکھنا قیمت کہ آپ اپنی یہ رشک آجائے میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے
اور یہ خیال ایک دوسری جگہ :

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے مرنے میں دلے انکی تمنا نہیں کرتے

پھر فرماتے ہیں :

اپنی گلی میں مجکو نہ کر دین بعد قتل میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے
نلا ہر ہے، کہ یہ بھی رشک کے موضوع پر اپنی طرز کا ایک بالکل اچھوتا

اور نرالا تخیل ہے، پھر فرماتے ہیں :

نہیں کہ ہم ہی آسان نہ ہو یہ رشک کیا کم ہو ندی ہوتی خدایا آرزوئے دوست دشمن کو
یعنی رقیب کے لئے دوست کا پالینا اگرچہ ایک ہنامت و شنوار امر ہے، لیکن
ہمارے لئے توقف اس کا آرزو مند ہونا بھی بلائے جان ثابت ہو رہا ہے،
گویا مرزا کے نزدیک محبوب کی خواہش کہ نا شان غیرت کے سراسر خلاف
ہے، اسی طرح :

آتا ہے میرے قتل کو پر جوش رشک سے مٹا ہوں اُس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر
محبوب ہاتھ میں برہنہ تلوار لئے آتا ہے، لیکن یہ ہیں، کہ بجائے خوفزدہ
ہونے کے رشک ہی سے مرے جاتے ہیں، کہ اے کاش ! تلوار نے جس
ہاتھ تک رسائی حاصل کر لی ہے، میں کیوں اس سے محروم رہا، پھر
فرماتے ہیں :

گوہر کو عقد گردنِ خوباں میں دیکھنا کیا آوج پرستارہ گوہر فروش ہے
یہ شعر بھی اسی احساس کا ترجمان ہے، جس کا اوپر ذکر ہوا، جس طرح گوہر کی
انتہائی شان یہ ہے، کہ وہ محبوب کے گلے کا رہنے، اسی طرح گوہر فروش
کی انتہائی خوش قسمتی یہ ہے، کہ اس کے بیچے ہوئے موتی اُس نازک اور

سراجِ ناکِ گردن میں جھلکتے ہوئے دکھائی دیں، لیکن غریب مرزا کے حصّے میں یہاں بھی سوائے رشک کے اور کچھ نہیں آیا، اسی انداز پر ایک اور شعر ہے :-

تسے جو اہرِ طرفِ کُلاہ کو کیا دیکھیں ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں
اس کے علاوہ :-

چھوڑا نہ رشک نے کہ تسے گھر کا نام لو ہر اک سی پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں
”جاؤں کدھر کو میں؟“ یہ کوئی بامعنی فقرہ نہیں ہے، لہذا نہ کوئی اسے سمجھ سکتا ہے، اور نہ محبوب کے گھر کا صحیح پتہ چلتا ہے، اور یہ ہیں، کہ رشک کے بالے ہوئے جگہ جگہ ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں !
غالب کی عشقیہ شاعری پر ایک حد تک بحث ہو چکی، اب ہم دوسرے عنوان کو لیتے ہیں :

صوفیانہ مرزا کا تصوف بھی ذوقِ معرفت اور روحانی زندگی کے بلند ترین اصولوں سے لبریز ہے، جو بات دوسروں کے ہاں خاص ہے، انکے نزدیک عام ہے، اور جسے یہ خاص سمجھتے ہیں، اس کا منبعِ سدرۃ المنہا سی بھی پرے انوار اور تجلیاتِ الہی کا وہ سرچشمہ حیات ہے، جو عرشِ معلّٰی کے نیچے نیچے بہتا ہے، جہاں نہ انسانی آنکھ کو رسائی ہے، اور نہ فکر و غور کا قدم دہاں دخل پا سکتا ہے، مرزا انسان کی اس کوتاہ بینی اور غفلت کا جب ذکر فرماتے ہیں، تو کہتے ہیں :

حرم نہیں، تو ہی نواہائے راز کا یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہی ساز کا

یعنی دنیا میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں، جو محبوبِ حقیقی کے پر تو جمال سے
تحتاجی نہ ہو، لیکن تمہاری اپنی آنکھ اس قابل نہیں، کہ تم اس کے اسرار
اور کیفیات کو دیکھ سکو، اور نہ تمہارے کان ابھی اس لائق ہوئے ہیں، کہ
معرفتِ الہی کے اُن نغموں کو سُن سکیں، جو کائنات کے ذرے ذرے
سے پیدا ہو ہو کر بارانِ نور کی طرح فضا میں پھیل جاتے ہیں، اس لحاظ
سے انسان کی یہ کیفیت **وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَكِنْ
لَّا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ** کی مصداق ثابت ہو رہی ہے،

عرفی نے بھی اس خیال کو نہایت خوبی سے ادا کیا ہے، وہ کہتا ہے:
ہر کس شناسندہ راز ست و گرد اینہا ہمہ راز ست کہ معلوم عوام است
پھر مرزا کے نزدیک انسانی شرف کا جو انتہائی معیار ہے، اُسے بھی ملاحظہ
فرمائیے:

عشرتِ قطر ہے دیبا میں فنا ہو جانا درود کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا
تو گویا:

دل ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا
اس مرتبہ کمال کو پالینے کے بعد بھی انسان خفائقِ اشیاء کو سمجھ نہ سکے
تو یہ اُس کی انتہائی بد قسمتی ہے، مرزا فرماتے ہیں:
قطرہ میں جلد دکھائی دے اور جزو میں کل کھیل لڑکوں کا ہوا دیدہ بنیاد ہو !

لے آئیہ شریف: "اسماں و زمین میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں، جو خدا کی حمد و ثناء بیان نہ کرتی
ہو، لیکن، تم (اپنی ناقابلیت کی وجہ سے) اس کو سمجھ نہیں سکتے" ۱۷

اس شعر کا حین انداز اور زورِ بیان حد درجہ قابلِ وادہ ہے، اس کے بعد مرزا ایک سالک کے اُن مدارج کو جو اُسے راہِ معرفت میں پیش آیا کرتے ہیں، اس طور پر بیان فرماتے ہیں :

وام ہر موج میں سچا حلقہ صد کام ہنگام
دیکھیں کیا گدے ہر قطرے پیکرِ نچوہنگ

ان صد ہا مشکلات کو جو اس خطرناک منزل میں ایک طالبِ حق کو پیش آسکتی ہیں، اس خوفناک اور موثر پیرایہ میں ظاہر کرنا، مرزا جیسے نغزگو شاعر ہی کا حصہ ہو سکتا ہے !

پھر فرماتے ہیں :

آرائشِ جمال سو فاسخ نہیں ہنوز پیشِ نظر ہے آئینہ و اُم نقاب میں
فلسفہ تصوف پر یہ ایک عظیم النظیر شعر ہے، اس میں ثابت یہ کیا ہے، کہ کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز اُسی کے پر تو جمال سے زندہ ہے، وہ بذاتِ خود اگرچہ بہ تقاضائے کبر و غرور اپنے چہرہ پر نقاب لٹے ہوئے ہے، لیکن اُس کی تجلیات نقاب سے بھی چھن چھن کر عالم کو بقیعہ نور بنا لے دیتی ہیں، تو گویا :

شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے ہی ہیں کتنے بے حجاب کہ میں یوں محتاج
جب حُسن کا فیض اس قدر عام ہے تو کہاں ہے وہ آنکھ جو اس سے لذتِ یاب ہو، اور کہاں ہے وہ دل جو اس کی شعاؤں کو اپنے اندر جذب کر لے ؟ :

جلوہ از بسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہے جو ہر آئینہ بھی چاہے ہی مرزا کا ہونا

تو اس لحاظ سے معلوم ہوا، کہ خود ہمارا وجود بھی اُسی پردہ نشین کے
ناز و ادا، اور ذوقِ تزیین کا ایک ادھورا سا نقش ہے :-

دہر جز جلوه یکتائی معشوق نہیں لے ہم کہاں تھے اگر حسن نہ ہوتا خود میں
جب دنیا ارتقاء کی ان منزلوں سے گزرتی ہوئی اپنی تکمیل کو پہنچ لیگی
تو وہ بھی فوراً اپنی نقاب اُلٹ دیگا، کوئی چیز اُس کی تاب نہ لاسکے گی، ذرہ
ذرہ اپنی جائے قرار سے متحرک ہوگا، کائنات میں ایک بے پناہ انتشار پیدا
ہوگا، اور اسی کا نام ہنگامہِ عرش ہے !

ہوئی اس جہروش کے جلوہ متعال کے آگے لے پرافشاں جو ہر آئینہ میں مثلِ ذرہ رودیں
اور ابھی ہر چیز اپنے فطری ذوق کی بنیاد پر اس وقت کے انتظار میں ہے،
اور مادہ اندر ہی اندر جوش کھاتا ہے :

کس کا سرِ باغِ جلوہ حیرت کو اے خدا آئینہ فرشِ شش جہت انتظار ہے
اس کے بعد مرزا کے صوفیانہ جذبات میں ایک خاص بات یہ بھی ہے

لے ملکن بھی "گمشدہ بہشت" میں ایک فرشتے کی زبانی بنی نوع کو یہی
پیغام پہنچاتا ہے، وہ کہتا ہے، "اے آدم ! وہی خدائے بزرگ و برتر اور ہی قادر
مطلق ہے، جسے ہم تمام موانعی تاثرات کا منبع و مخرج قرار دیکھتے ہیں، اور فی الحقیقت
وہی ذاتِ واحد ہے جس سے تمام چیزوں نے جلوہ پایا، سو اگر تم اپنی تخلیق کے مقصد
کو پہچانو، اور اُس کے فرمانبردار ہو جاؤ، تو یاد رکھو ! کہ پھر اس سے زیادہ فیاض اور
جربان بھی اور کوئی نہیں ہو سکتا، ... تم دنیا میں اس کے جلال اور کبریا
کے ایک بہترین منظر ہو، اُس کا حسن قدر افزائی جاتا ہے، اور تمہارا کام ہے محبت کرنا !"

سَلِّحْ قُرْبَانَ جِدِّی جَاوِ الْجَبَالِ کَا الْعَيْنِ الْمَفْعُولِ (سپاہِ اس روزِ نبی
ہوئی چشم کی طرح ہر طرف اڑتے ہوئے دکھائی دینگے) کا ذکر آیا ہے تو سمجھ لینا چاہیے، کہ یہ دنیا کے اسی خاتمِ نقشہ ہے

کہ وہ انسان کو عبادت کے معاملہ میں اخلاص کی بڑی تاکید کرتے ہیں، مثلاً :

طاعت میں تاہونہ دے دیجیوں کی لاگ دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو گویا جہاں یہ ہیں، وہاں نفسانی خواہشات کو کوئی دخل نہیں، جزا کی تمنا رکھنا تو ایک قسم کی سوداگری ہے، ایک طالب حق کے نزدیک خدا کا غضب ہی اُس کے لئے جہنم ہے، اُسے جنت کی گونا گون نعمتیں اتنی بھلی معلوم نہیں ہوتیں، جتنی کہ اپنے محبوب کی خوشنودی اسی بنا پر ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

ستائش گریز ہذا بقدر جس باغِ قبول کا وہ اک گلدستہ ہی ہم بخود و طاقِ نسیا کا اور بقولِ مومن :-

غضب سے تیرے ڈرنا ہوں رضا کی تیرے خواہش ہے

نہیں ہزار دوزخ سوز میں مشتاقِ جنت کا

اخلاقیات حق تو یہ ہے، کہ اخلاقیات کی جیسی عمدہ تعلیم مرزا نے دی ہے، کسی اور کے ہاں دیکھنے میں نہیں آئی، اندازِ نہایت پیارا اور دلاویز ہے، بعض جگہ ایک بات کو غولیت کا رنگ دیکر اس طور پر بیان کر جاتے ہیں، کہ زبان سے سوائے تحسین و آفرین کے اور کچھ نہیں نکلتا، اس ضمن میں سب سے مقدم چیز غیرت اور خود داری کی تعلیم ہے، کیونکہ مرزا کے اخلاقی حصہ کلام کا بیشتر عنصر ایسے ہی عمدہ مضامین پر مشتمل ہے، اسلئے چند مثالیں یہاں نقل کر دی جاتی ہیں، ملاحظہ ہو :

درومنت کیش و دانہ ہوا میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا
یعنی اگر میں محتیا ب نہ بھی ہوا، تو اس میں کیا بُرائی ہے، کسی دوا کا
شر مندہ احسان تو نہیں، اسی طرح :

ریخ نو میدی جاوید گوارا رہو خوش ہوں گزنا لہ زبونی کش تا تیر نہیں
فرماتے ہیں، کہ ہمیشہ کی نامیدی اس سے کہیں بہتر ہے، کہ میرا نالہ
کسی اثر کا شر مندہ احسان ہو، اور ایسی حالت میں اُمید کا برنہ آنا بھی ایک
نعمتِ غیر مترقبہ ہے، ایک اور جگہ کہتے ہیں :

ڈالانہ بیکی لے کسی سے معاملہ اپنے سے کھینچتا ہوں نجالت ہی کیوں نہ
یعنی میری بیکی اگر ہے بھی، تو اپنے ہی لئے ہے نا، کسی اور پر تو اس کا بوجھ
نہیں، اس لئے اگر ایسی حالت پر نادم اور شر مندہ بھی ہو، تو یہ بھی میرے
اپنے ہی لئے ہے، کسی اور کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کرتا، اسی انداز
پر ایک اور شعر ہے :

دیوار بار منتِ مزدور سے ہے خم لے خانماں خرابہ احساں اٹھائیے
کسی گھر والے کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے، کہ اگرچہ تیرے گھر کی دیوار
جھکتے جھکتے اب بالکل گرنے کے قریب آن پہنچی ہے، لیکن اس کی مرمت
ہرگز نہ کراؤ، کیونکہ تجھے معلوم نہیں، کہ دیوار کا خم ہو جانا منتِ مزدور کا
بوجھ نہ سہا رکھنے کی وجہ سے ہے، اس لئے دیوار گر جائے، تو گر جائے،
لیکن کسی کا شر مندہ احسان ہونا اچھا نہیں، الغرض :

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

پھر غیرت اور خود داری کی انتہا یہ ہے کہ :
 بیٹے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو، ہم سخن کوئی نہ اور ہم زباں کوئی نہ ہو
 بے درد دیوار سا اک گھر بنایا چاہیئے کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
 ٹپٹے گریہ کرتا کوئی نہ ہو تیسرا دروازہ اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو
 کیونکہ درد دیوار، ہمسایہ، پاسباں، تیمار دار، اور نوحہ خواں وغیرہ تمام
 ایسی چیزیں ہیں، جن کے معاملات سے لازمی طور پر ہمیں شرمندہ احسان
 ہونا پڑیگا، لہذا ایسے اسباب ہی کو منقطع کر دینا چاہیئے، جن سے اس فلت
 اور مذمت کا امکان ہو،

عشقیتہ معاملات میں محبوب کی غفلت اور کج ادائی کا برداشت
 کر لینا عاشق کے لئے کوئی نئی اور عجیب چیز نہیں ہے، لیکن یہاں بھی
 جب حالات اس کے برعکس ہوں، اور عشق کی غیرت کسی ایسے اقدام
 کی اجازت نہ دے، جس سے اس کی صداقت کو صدمہ پہنچتا ہو، تو مرزا
 صاف لفظوں میں پکار اٹھتے ہیں :-

تغافل و ست ہوں میرا دماغ عجزِ عالی ہو اگر پہلو ہتی کیجے تو جا میری بھی عالی ہو
 یعنی اے تغافل کیش محبوب! سن رکھ کہ اگر تیرا غرورِ حسن تجھے اس بات

لے تعجب ہے کہ یہی خیال چوپ کے ہاں بھی بالکل نہیں الفاظ میں پایا گیا، وہ کہتا ہے :-

Thus let me live, unseen, unknown,

Thus unlamented let me die,

Steal from the world, and not a stone,

Tell where I lie.

کی اجازت نہیں دیتا، کہ تو مجھ سے محبت اور تپاک کے ساتھ پیش آئے
 تو میں بھی یاس ہمہ عمر و نیاز بڑی جرأت اور انتہائی صبر و استقلال کے
 ساتھ تجھے مسترد کر دینے کے لئے تیار ہوں، اور اس میں کوئی چیز بھی
 مجھے مانع نہیں آسکتی، پہلو ہتی کرنا“ محاورہ کی رو سے نفرت اور
 بے اتفاقی کا اظہار کرنے کو کہتے ہیں، حقیقت میں یہی پاکیزہ احساس ہے
 جس کی ترجمانی ایک دوسری جگہ مرزا نے اس طور پر کی :
 وہ اپنی خون چھوڑینگے ہم اپنی وضع کیوں لیں سبکے بنکے کیا پوچھیں کہ ہمسو گراں کیوں ہو
 اور سچ پوچھیے تو اس تمام بحث کا حاصل عزت نفس کی پاسداری
 ہے اور کچھ نہیں !

علاوہ ان باتوں کے حسد کا علاج کیا خوب تجویز فرمایا ہے، کہتے ہیں :
 حسد سے دل اگر افسردہ ہو کر نرم نہاشا کہ چشم تنگ شاید کثرتِ نظارہ دہو
 چشم حسد کی تنگی مشہور ہے، جب ایک شخص کسی محد وہ جگہ میں رہتے
 رہتے کسی کے کمال یا ترقی کو دیکھ دیکھ کر حسد کے مرض میں مبتلا ہو جائے
 تو اس کا بہترین علاج یہ ہوگا، کہ وہ بیرونی دنیا کا بھی مشاہدہ کرے کیونکہ
 جب وہ دیکھیگا، کہ ترقی محض ایک اتفاقی چیز نہیں ہے، بلکہ اس
 کے لئے جستجو اور محنت سے بھی کام لینا پڑتا ہے، تو اس حقیقت کے
 روشن ہو جانے پر اس کی باطنی کاوش مٹ جائیگی، اور وہ تحصیل کمال
 میں بذات خود ماسعی ہوگا، نیز جب وہ دیکھیگا، کہ مجھ سے زیادہ
 نادار اور غراب حال لوگ بھی دنیا میں موجود ہیں، تو اس مشاہدہ سے

بھی اس کے دل کو ضرور تسلی حاصل ہوگی ،

گویا بقول ختم :۔

ہرگز کہ غمے ملازم دل شود ت باقصہ کار خویش مشکل شود ت
حال دل دیگرے ببا ید پر سید تا خوشدلی تمام حاصل شود ت
پھر گفتگو اور طرز کلام میں بھی احتیاط اور نرمی کی تلقین فرماتے ہوئے
لکھتے ہیں ، کہ :

گرمی ہسی کلام میں لیکن نہ اس قدر کی جس سببات اسوشکائت ضرور کی
یعنی لوگوں کے ساتھ شیریں کلامی اور تملطف سے پیش آنا چاہیئے ،
تلوار کا گھاٹ مل جاتا ہے ، لیکن زبان کا پیدا کیا ہوا زخم کبھی مندمل نہیں
ہوتا ، قرآن مجید کی ایک آیت ہے : اُدْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ
وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ دَعَا لَهُمْ بِالَّتِي هِيَ اِحْسَنُ لِعَيْنِي جب تم
کسی شخص کو راہِ راست کی طرف دعوت دو ، تو چاہیئے ، کہ اُسے شیریں کلامی
اور حکمتِ عملی کے ساتھ پیا را اور محبت سے اپنی طرف بلاؤ ، اور گفتگو کا ایسا
پیرایہ اختیار کرو ، کہ وہ تم سے متنفر نہ ہو جائے ۔“

اسی طرح جب عفو و درگزر کی تعلیم دیتے ہیں ، تو فرماتے ہیں :

نہ سونو گہ بُرا کہے کوئی نہ کہو گر بُرا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی بخش دو گر خطا کرے کوئی
جب توقع ہی اٹھ گئی غالب کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی
ایک اور جگہ کہتے ہیں :

جو مدعی بنے اُس کے مدعی بنئے جو ناسرا کہے اُس کو نہ ناسرا کہیے
 سفینہ جب کہ کنا لے پہ آگیا غالب خدا سے کیا ستم و جور نا خدا کہیے
 یعنی جب مشکلیں حل ہو گئیں، اور حالات نے ماعنی کی شکل اختیار کر لی،
 تو اب شکوہ و شکایت سے کیا حاصل، لہذا مصلحت اسی میں ہے، کہ حریفوں
 کی سختیوں اور بغا کاریوں پر حتم پوشی اختیار کرتے ہوئے، عفو و درگزر سے
 کام لیا جائے، یہاں بھی قرآن مجید کا ارشاد پیش نظر رہنا چاہیے: اِدْفَعْ
 بِالَّتِي هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهُ
 وَدِّيٌّ حَصِيْمٌ، یعنی: جہاں تک ہو سکے برائی کا جواب بھلائی سے دو، کیونکہ
 جب تم لوگوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ گے، تو دشمن بھی اس طرز عمل
 کو دیکھ کر تمہاری دوستی اور محبت کا دم بھرنے لگیں گے۔
 مرزا کا ایک قطعہ پند و مواعظت میں لاشانی ہے، اور اسی پر ہم اس بیان
 کو ختم کرتے ہیں:

اے تازہ وار و ان بساط ہو دل	زہنا اگر تمہیں ہو بس نائے دلوش ہو
دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو	میری سنو جو گوش نصیحت نبوش ہو
ساقی بجلوہ دشمن ایمان و آہی	مطرب بہ نغمہ رہنر تکلیں و ہوش ہو
یاشب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشہ بساط	دامان باغبان و کف گفردش ہو
لطف غرام ساقی و ذوق صد چنگ	یہ جنت نگاہ وہ فردوس گوش ہو
یا صمد جو دیکھئے آکر تو بزم میں	نئے وہ سرور و سوز نہ جوش نخر و شہ ہو
وارغ فراق صحت شب کی جلی ہوئی	اک شمع رہ گئی ہی سودہ بھی خوش ہے غواں

آتے ہیں غیب سے یہ مضا میں خیال میں
غالب صریح خام نوائے سرُش ہے

فلسفیانہ [بولوں تو مرزا کا انداز ہی بجائے خود ہمیشہ فلسفیانہ ہوا کرتا ہے]
لیکن پھر بھی ذیل میں چند ایسی مثالیں نقل کر دی جاتی ہیں، جن سے شاعر
کی بلند نظری اور فلسفیانہ ذوق کا خاص طور پر پتہ چلتا ہے، فرماتے ہیں :
نقش فریادی ہو کس کی شوقی تحریر کا کاغذی ہے پیرن ہر پیکر تصویر کا
یہ شاعرانہ انداز میں ایک شکاکیت آمیز حمد و ستائش ہے، جس سے
اپنے محبوب کے ساتھ ناز و داد اور شوقی کا اظہار بھی ہوتا ہے، ولایت میں سم
تھی، کہ داد و خواہ کاغذی جامہ بینکر عدالت میں جایا کرتے تھے، مرزا اُسی
خیال کے پیش نظر فرماتے ہیں، کہ جس طرح ایک تصویر اپنے مصور کے
کمال کو ظاہر کرتی ہے، اسی طرح دنیا کی ہر چھوٹی بڑی چیز بھی اپنے صانع
حقیقی یعنی خداوند تعالیٰ کے کمال صنعت پر بزبانِ حال داد دے رہی ہے
لیکن قاعدہ ہے، کہ جب ایک چیز پیدا کی جائے، تو اُس پر تنقید بھی ہوتی
ہے، پس اس چیز کا فریاد کرنا اس وجہ سے ہوا، کہ اگر مجھے پیدا کیا تھا، تو
دیکھئے والوں کو بھی ایک ایسی نظر عطا کی ہوتی، جس سے وہ میرا سر اور روز
کو کا حق سمجھ سکتے، تو گویا :

مجھ کو پیدا کر کے اپنا نکتہ چیں پیدا کیا
نقش ہوں اپنے مصو سے گلہ لکھا ہو نہیں (اقبال)

جب انسانی بستیوں پر غفلت اور چمٹو کی یہ کیفیت طاری ہو ادا

بے بصیرتی اس حد تک پہنچ جائے، تو پھر ظفر کا یہ قول صادق آئیگا :
 روزِ معمورہ دنیا میں خرابی ہو ظفر ایسی بستی سے تو ویرانہ بنایا ہوتا
 بلکہ بہتر تو یہی تھا نہ بنایا ہوتا

پس یہی ہے غامت اُس مفہوم کی جسے مرزا نے اپنے شعر میں بیان
 کیا ہے،

اسی طرح ایک اور جگہ فرماتے ہیں :
 مری تعمیر میں مضمحل ہے اک صورتِ خلی کی، بیہولی برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم تھاں
 اس شعر میں سمجھانا یہ چاہتے ہیں، کہ ہماری موجودہ ہیئتِ کدائی میں بربادی
 اور فنا کے آثار بھی ایک مبہم اور نامعلوم طور پر پائے جاتے ہیں، اور شمال کے
 طور پر ہماری یہ کیفیت اُس کسان کی محنت اور جانفشانی سے مشابہ ہے
 جو رات و دن کھیت پر کام کرتا رہتا ہے، اور اسے معلوم نہیں ہوتا، کہ خون
 کی وہی حرارت جو لگاتار اور مسلسل کام کرنے سے پیدا ہوتی تھی، نتیجہ کار
 برق کی صورت اختیار کرتے ہوئے خرمن کو جلا کر خاک سیاہ کر ڈالے گی،
 "خونِ گرم" استعارہ ہے "محنتِ شدید" سے، اگر اس مفہوم کو اور بھی زیادہ
 صاف کرنا چاہیں، تو اقبال کے ایک شعر سے تطبیق دی جاسکتی ہے،
 وہ فرماتے ہیں :

دوایِ غنچہ میں ہو رازِ آفرینش گل عدمِ عدم ہے کہ آئینہ دار ہستی ہے
 اس شعر کا مطلب غالب کے شعر سے بالکل متضاد واقع ہوا ہے،
 یہاں عدم سے ہستی کا اثبات کیا گیا ہے، تو وہاں ہستی سے عدم کا،

اسی طرح مرزا کا ایک اور شعر ہے :

ہم موحّد ہیں ہمارا کیش ہی ترکِ روم ملتیں جب مٹ گئیں اجڑے لپ گئیں

یہاں مذاہب اور ادیان کے فلسفہ ضعیف و قوت کو بیان کیا گیا ہے، اس کا مفہوم سمجھنے کے لئے سب سے پہلے ہمیں عالمِ محسوسات پر نظر ڈالنی چاہیئے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں، کہ یہاں کی ہر اعلیٰ چیز اپنی ادنیٰ کو، اور ہر قویٰ چیز اپنی ضعیف کو جذب و مضغ کر جاتی ہے، اور اسی سے اس کی زندگی اور بقا ہے، چنانچہ جمادات نباتات کی غذا بنتے ہیں، اور نباتات حیوانات کی اور پھر حیوانات بھی حیوانِ اشرف یعنی انسان کی غذا کا کام دیتے ہیں، پس اسی طرح سے عالمِ ظاہر کا یہ سلسلہ قائم ہے، گویا نیٹشے کے الفاظ میں :-

”طاقتور چیزوں کی خدمت گزاری کے لئے کمزور چیزیں اپنے آپ کو ہرقت آمادہ و مستعد پاتی ہیں، حالانکہ اس خدمت گزاری سے ان کا مقصد اپنے سے بھی زیادہ کمزور ہستیوں پر قدرت اور فوقیت حاصل کرنا ہوتا ہے؛ یہ ایک ایسی سترت ہے جس سے کوئی چیز بھی محروم نہ ہوگا اور انہیں کر سکتی اور جس طرح چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی حصولِ بقا کے لئے اپنے آپ کو نثار کر دینے کے لئے تیار رہتی ہے، اسی طرح بڑی سے بڑی شے کو بھی اس ضرورت کی بجا آوری میں اپنا آپ قربان کر دینے سے ذرا بھی دیر نہ ہنسنی پڑتا“

اور یہی بات مولانا روم بھی فرما چکے ہیں ع

جملہ عالم آکل و ماکول داں !

جب ظواہر اور محسوسات میں یہ قانون اپنی پوری طاقت سے جاری ہے،

تو کیوں رُوحانی دُنیا میں بھی اس کے عمل کو تسلیم نہ کر لیا جائے، چنانچہ اسی خیال سے کہ انسانوں کے عقائد بھی اپنے ضَعُوف و قوَّت کے اعتبار سے ایک دوسرے کو جذب و مضَم کر لے رہتے ہیں، ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں ج

پس معانی را چو اعیان حلق ہاست

اس قانون کے ظاہری عوامل سے گذر کر باطنی شواہد پر غور کیا جائے، تو معلوم ہوگا، کہ مرزا نے بھی اپنے شعر میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے وہ فرماتے ہیں، کہ توحید سے زیادہ یقینی اور پختہ مذہب چونکہ دُنیا میں اور کوئی ہو نہیں سکتا، لہذا اس کے علاوہ جتنی ملتیں بھی ہیں، وہ انسانوں ہی کی ساختہ و پرداختہ ہیں، اور ان کی تشکیل فقط رسوم و عادات سے ہوئی ہے، اس لئے وہ اپنی کمزوری اور ضَعُف کی بنا پر اسی ایک مرکز یعنی توحید ہی میں آکر فنا ہوتی، اور اسی کا جزو بن جاتی ہیں؛

اس فلسفیانہ انداز میں ملت و آئین کے تمام اجزائے باطلہ کو ایک ہی چیز یعنی دین حق میں تحلیل کر کے رکھ دینا مرزا جیسے شخص ہی کا حصہ ہو سکتا ہے !

پھر فرماتے ہیں کہ :
 پنج سے خوگر ہو، انساں تو مٹ جائے پنج مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آسان ہو گئیں
 مشکلوں کو بہتے بہتے نتیجہ کار ان کا آسان ہو جانا بالکل نئی قسم کا استدلال ہے، قاعدہ ہے، کہ ایک چیز شروع شروع میں انسان کو بہت تکلیف دیتی

لیکن جب انسان عادی ہو جائے، تو اس کا ذرا بھی احساس نہیں رہتا
مرزا نے بھی ”فلسفہ غم“ کے اسی دقیق نکتے کو ایک وجدانی انداز میں شعر کا جامہ
پہنایا ہے !

اسی طرح ایک اور شعر ہے :

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی چمن زنگار ہے آئینہ باد بہاری کا
فرماتے ہیں کہ انسان کے لطیف اور پاکیزہ جذبات و اعمال بغیر کشیدگی
اور غفلت کے ہرگز فروغ حاصل نہیں کر سکتے، اور پھر اس مفہوم کو ایک
ہنائیت بلغیانہ انداز میں اس طور پر واضح کیا ہے، کہ باد بہاری کا وہ
صاف و شفاف آئینہ جس میں بجائے خود کوئی کثیف جز و موجود نہیں،
اس وقت تک بالکل ناقص اور بے رونق رہتا ہے، جب تک کہ چمن
کی رعنائی اور شوقی اس میں جذب و کشش کا سامان پیدا نہ کرے، گویا
پھولوں کی رنگینی اور سبزے کی افراط اس آئینے کے لئے بمنزلہ زنگار کے
ہے، جو اس کی غایت تخلیق کو کمال کے درجہ تک پہنچا دیتا ہے،

پس یہی ہیں، وہ متضاد کیفیتیں جنہیں صوفیا کی اصطلاح میں بھی
قبض اور لبسط کے دو جامع الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے، اور یہی ہے وہ
احساس جسے شعراء آمد اور آرد سے تعبیر کرتے چلے آئے ہیں !

مذہب میں یہی ”کثافت“ وہ لغزش مستانہ ہے جس پر سے ہزاروں
عبادتیں قربان، اس بنا پر میں کہوں گا، اور بلا خوف تردید کہوں گا، کہ دنیا
میں گناہ کا عقیدہ بجائے خود کوئی حقیقت نہیں رکھتا، انسان زندگی کے

انہیں ادوار سے گزرتا ہوا منزل مقصود تک پہنچتا ہے، اس کی خامیاں حقیقت میں نیکیاں ہیں، جو اندر ہی اندر اس کی روحانی اور فطری قوتوں کو پائیدہ تکمیل تک پہنچانے کے درپے رہتی ہیں، تمدن تو میں اپنے دور و حشت کی یادگار ہوا کرتی ہیں، اسی طرح سمجھ لینا چاہیے، کہ ترقی یافتہ افراد بھی بنات خود اپنے گزشتہ حالات و واقعات کا آئینہ ہیں، اگر انسان ذہن رسا اور فطرت سلیم رکھتا ہو، تو اُس کی کثافت بھی نتیجہ کارِ لطافت بن کر رہتی ہے؛ کیا ہم ایک لمحے کے لئے بھی گناہ کو کوئی مستقل اور بامعنی لفظ تسلیم کر سکتے ہیں؟ کبھی نہیں! فطرت کا حاکم نہ اقتدار کسی حالت میں بھی اسکی تائید نہیں کر سکتا، اشیائے عالم کی تخلیق سے قدرت کا مقصد خیر ہے، شر برگز نہیں! **فَطَرَهُ اللَّهُ الَّذِي فُطِرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ** اس بیان کی ایک واضح اور بین شہادت ہے، انسان کی تعمیر فی الحقیقت اسی پاکیزہ اور مقدس احساس سے ہوئی ہے، اور یہ ایک ایسا دائمی اور باری قانون ہے، جسے روئے زمین کی کوئی طاقت کسی صورت میں بھی متغیر نہیں کر سکتی؛ حق اُسی وقت فروغ پاتا ہے، جب اُس کے مقابلہ میں ایک باطل قوت بھی موجود ہو؛

تیرہ کار رہا ہے انل سے تا امروز چراغِ مصطفویٰ سے شرارِ بولہبی

(اقبال)

اور بقول میر: کفر کچھ چاہیئے اسلام کی رفق کیلئے حسن و زنا رہے تسبیح سلیمانی کا — دنیا میں علم کی گرم باتاری اور قدر افزائی فی الحقیقت جاہلوں کی

عبرتِ ناک حالت سے وابستہ ہے، یقیناً اُس وقت تک نہیں ہوا، جب تک اُس نے شک اور تذبذب کی ہولناک وادیوں میں ایک مدت تک ٹھوکر نہیں کھائیں؛ رات کے وقت جگمگاتے ہوئے ستارے اپنے اندر بے انتہا کشش رکھتے ہیں، لیکن غور سے دیکھا جائے، تو ان کی اس لطافت اور چمک دمک کو دوبالا کرنے والی چیز دُعا تاریکی ہے، جس نے دُنیا کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے، جگنو اپنی خوبصورت روشنی کے ساتھ ہر وقت موجود ہے، لیکن اُس کی یہ چمک بھی بغیر اندمیرے کے دیکھی نہیں جاسکتی: اسی طرح سمجھ لیجئے، کہ نیکی اور بدی بھی دونوں ساتھ ساتھ چلتی ہیں، اور زندگی کی ناگوار حالتیں ہمیشہ اس کے نقائص اور عیوب کو ایک مبہم اور نامعلوم طریق پر زائل کیا کرتی ہیں!

الحسنات میں ان الحسنات یثمنہن السیئات (نیکیاں بدیوں کو مٹا دالتی ہیں) اور پھر یُبَدِّلُ اللہُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ (خدا سلیم الفطرت انسانوں کے گناہوں کو بھی نیکیوں سے بدل دیا کرتا ہے) کا مطلب بھی سوائے اس کے اور کچھ نہیں، کیونکہ برائیوں کا نیکیوں سے بدل جانا ہی معنی رکھتا ہے، کہ اگر وہ شخص پہلے جھوٹ بولا کرتا تھا، تو اب ہمیشہ سچ بولے گا، یا پہلے وہ لوگوں کا مال ناحق طور پر غصب کیا کرتا تھا، تو اب صدقات و خیرات میں کثرت سے حصہ لے گا، پہلے کسی کو ایذا پہنچاتا تھا، تو اب اُس کی دلجوئی اور خدمت گزاری کو اپنی سعادت سمجھے گا، الغرض اس کی ہر نیکی اُس برائی کی ضد ہوگی، جو وہ پہلے کیا کرتا تھا، اور جب تک یہ تقیید لازم نہ سمجھ لی جائے، اعمال کی تلافی خاطر خواہ طور پر ہو نہیں سکتی، کیونکہ آگ کو صرف پانی ہی بجھا سکتا ہے، کوئی اور چیز خاموش نہیں کر سکتی!

نہایت توجہ عالم اور اُس کی تخلیق کو بھی اسی معنوی تضاد کا موجب قرار دیتا ہے، اُس کے نزدیک بھی باطل کا وجود محض حق کو فروغ دینے کے لئے ہے، چنانچہ کس شعرت اور کس حس انداز سے گویا ہے :-

”جب تخلیقی نظر سے میں نے دیکھا، تو خیر اور شر، خوشی اور غم، ہم ادم — غرضیکہ کائناتِ عالم کی جملہ اشیاء مجھے ایک رنگین غبار کی مشعل دکھائی دیں؛ پھر ان تمام چیزوں کو وجود کا جامہ کس نے پہنایا؟ اور دُنیا کس طرح نمودار ہو گئی؟ — یہ صرف اس وقت تھا، جبکہ اُس پر نشین نے اپنی نیچی اور محجوب نگاہوں کو فضاؤں میں پھیل جانے کی اجازت دی“

اور آگے چل کر تو نہایت واضح طور پر کہتا ہے :-
 ”اے دوست! میں تجھ سے ہر برائی کی توقع رکھتے ہوئے ہر بھلائی کا طلبگار ہوں“

پھر اس باب میں ایک عامیانه اور گمراہ کن ذہنیت کی تردید کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

”مجھے تسلی دینے کے لئے تمام داناؤں نے کہا، کہ انسان مجتہد شر ہے، جیف ہے اُن کی دانشوری پر اور افسوس ہے، اگر لوگ آج بھی اسے صحیح تسلیم کر لیں، اس لئے کہ تمہارے نزدیک جو شر ہے، میرے نزدیک دہی انسان کی تمام سعادتوں اور نعمتوں کا منبع و مخرج ہے“
 اس کے علاوہ جاوید نامہ میں بھی خیر و شر کے اسی نازک اور تشویشناک

مثلاً کہ جس خوبی سے زندہ رود شاہ ہمدان سے دریافت کرتا ہے، اور پھر اُس کی جانب سے اسپر جیسا تسلی بخش اور عمدہ جواب ملتا ہے، اس سے بھی میں ناظرین کو اس ضمن میں محروم رکھنا نہیں چاہتا، فرماتے ہیں :-

از تو خواہم سرزیداں را کلید طاعت از اجابتِ شیطان آفرید
زشتِ مانا خوش را چنباں آراستن ! لے در عمل از ماکوئی خواستن !
از تو پرسم این فسوں سازی کہ چه ! با تمارِ بد نشین بازی کہ چه !
مشتِ خاکِ این سپہر گر دگرد خود بگو می زیدش کا لے کہ کرد ؟
کارِ افسکارِ ما، آزارِ ما ! دستِ بادندالِ گردیدن کارِ ما !
جواب ملاحظہ ہو :-

بندۂ کز خویش تن دار و خبہ آفرید منفعت را از ضرر !
پرہم بادیواست آدم را دیال پرہم بادیواست آدم را جمال !
خویش را برابر ہمین باند زدن تو ہمہ تیغ اں ہمہ سنگِ فسن !
تیز تر شو تا فتد ضرب تو سخت در نہ باشی درد و گیتی تیرہ بخت !
ابن آدم کی یہی غفلت، یہی سست بنیادی، اور یہی تیرہ بختی ہی تو ہے جس پر دوسری جگہ ابلیس بھی ان الفاظ میں نالہ و فریاد کرتا ہے :-
اے خداوندِ صواب و ناصواب من شدم از صحبتِ آدم خراب

لے اس کا مطلب یہ ہے کہ :-
در میانِ قعرِ دریا تھمتہ بندم کرد ہ
یازمی گوئی کہ دامنِ ترکمن ہشیار باش

پہنچ کر از حکم من سر بر تنافت
 چشم از خود بست و خود را در نیافت
 خاکش از ذوق 'ابا' بیگانہ
 از شرار کبر یا بیگانہ
 صید خود صیاد را گوید بگیہ
 الاماں از بندہ فرماں پذیرا
 از چنیں صیدے مرا آزاد کن
 طاعت دیر وزہ من یا دکن
 بست از او اس ہمت والا من
 فطرت او خام و عدم او ضعیف
 ناب یکہ ہم نیار و این حرفت
 بندہ صاحب نظر با ید مرا
 یک حرفت پختہ تر با ید مرا
 لعبت آب و گل از من باز گیر
 حی نیاید کودکی از مرد پیرا
 ابن آدم چیست؟ یک مشت خست
 مشیت خس را یک شرار از من پس
 اندیں عالم اگر جز خس نبود
 ایں قدر آتش مرا و ادن چہ شود؟
 شیشہ را بگر اختن عارے بود
 سنگ را بگر اختن کا رے بود
 انہجناں تنگ از فتوحات آدم لے پیش تو بہر مکافات آدم

لے مطلب یہ کہ حضرت انسان کی حد سے بڑی ہوتی غفلت اور محبت نے مجھے
 بھی افسردہ اور مضطرب کر دیا، جو قوتیں مجھے نیرو آزمائی اور جنگِ جدل کیلئے عنایت کی گئی
 تھیں، وہ بیکار اور بی نتیجہ رہنے کی وجہ میرے لئے دیال جان ثابت ہو رہی ہیں، ایک طرف میں
 شکاں ہوں، تو دوسری جانب مجھے بھی شرمسار ہونا چاہیئے، کہ ایسی کمزور اور
 بزدل مخلوق کو میرے سامنے لاکھڑا کیا، جو ایک ضرب کی تاب بھی نہیں
 لاسکتی۔

پس بحالت موجودہ میری التجا کو سن، اور میری گذشتہ عبادت ہی کو یاد کرتے
 ہوئے مجھے اُس عذاب الیم سے نجات دلا، جو فی الحقیقت عذابِ دوزخ سے بھی
 زیادہ دردناک ہے!!

منکر خود از تو می خواهم، بدہ سوئے آں مرو خدا را ہم بدہ
 بندہ باند کہ پیچید گردنم لرزہ اندازد نگاہش در تنم
 آں کہ گوئد از حضور من برو آں کہ بیش او نیزم باد و جو

اے خدا یک زندہ مرے حق پرست
 لذتے شائد کہ یا ہم در شکست

اب آپ شیطان کی اس آرزو کا حقیقی مدعا بھی پہچانیئے، اور اس
 فلسفہ خیر و شر کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک دفعہ پھر غالب کی تمثیل پر بھی غور
 فرمائیے، کہ کس حین انداز اور منتہائے بلاغت سے اس کا حق ادا ہوا ہے
 لطافت کے کثافت جلوسہ پیدا کر نہیں سکتی چمن رنگار ہے آئینہ باد بہاری کا
 پس عملی اور اخلاقی نقطہ نگاہ سے بھی ان تمام مباحث کا حاصل
 یہ ہوا کہ :-

مزی اندر جهان کور ذوقے کہ یزداں دارد و شیطاں نہ دارد
 اسی طرح ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

دل میں پھر گریہ نے اک شہ اٹھایا غائب آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفان نکلا
 یہ بھی طبیعیات کا ایک مسئلہ ہے، اور تجربہ اس کا شاہد، جب کسی
 اندوہناک حادثہ سے انسان کی طبیعت بھر آئے، تو بے اختیار رونے کو
 جی چاہتا ہے، لیکن ایسی حالت میں اگر طبیعت پر جبر کیا جائے، اور دل کا
 غم آنکھوں کے راستے بہ نہ جائے، تو وہی آنسو بعد کو ایک قیامت لاتے
 ہیں، سینہ اندر سے دھکنے لگتا ہے، سانس رُک رُک کرتا ہے، اور بعض

دفعہ تو مریض غم کا اسی کش کش میں خاتمہ بھی ہو جاتا ہے !

ایک اور جگہ کہتے ہیں :

بیضہ آسانک بال دپرہیہ کج قفس از سر نو زندگی ہو کر رہا ہو جائیے
اس شعر میں مرزا نے حیات بعد المات کا فلسفہ بیان کیا ہے، مُرغی
کا بچہ جب تک انڈے کے اندر رہتا ہے۔ اُس کے لئے ہلنے بھلنے یا پرواز
کرنے کی بھی کوئی گنجائش نہیں ہوتی، اور نہ ہی قدرت نے ہنوز اتنا سامان
عطا کیا ہے، جو ایک غیر محدود پرواز کے لئے کافی ہو سکے، لیکن جو نہی دہ
اس دُنیا کی ہوا کھاتا ہے، ساتھ ہی اُڑنے اور پرواز کرنے کی تمام قوتیں بھی
خود بخود نشوونما پانے لگتی ہیں، اور وہ زندگی کی وسعتوں سے جس طرح چاہتا
ہے، لذت یاب ہوتا ہے، اسی طرح یہ دُنیا بھی انسان کی فطری قوتوں کے
لئے بالکل ناکافی ہے، رُوح جسم کے اندر چلائی اور نوحہ کرتی ہے، کہ اس محدود
خاکدان سے میری تسکین نہیں ہوتی، بلکہ اس کے لئے تو وہ بلندیاں درکار
ہیں، جن کا ذکر اقبال نے اپنے شعر میں کیا ہے :

پے ہر چرخ نیلی نام سی منزل سلمان سستے جس کی گرو راہ ہونہ کار و اتو ہوا
اسی طرح ہنرمی و گین بھی جب رُوح انسانی کے غیر فانی تاثرات
کو محسوس کرتا ہے، تو اس کا سازِ دل بھی اپنی معصومیت سے ایسے ایسے پاکیزہ
اور آسمانی نغمات پیدا کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے، کہ فی الحقیقت انہیں الہامی
چیزیں تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں، چنانچہ کہتا ہے، اور کس دالہانہ انداز میں

لہ انگلستان کا ایک مشہور اور بلند پایہ شاعر، ۱۶۲۱ء میں پیدا ہوا، ۱۶۹۲ء میں وفات پائی

کہتا ہے :-

”اے خدا ! اے وہ خدا کہ جس کی رُوح نے تیرے حکم کے مطابق اپنی تیزی اور رحمت سے پہلے پہل مردوں میں جان ڈالی اور اس مُرغی کی طرح جو اپنی شفقت اور محبت کے تقاضے سے متواتر اور مسلسل طور پر انڈوں کو سینچتی ہے : اپنے مقدس ہاتھ سے بنی آدم میں جان ڈالی۔“ ہاں خاک کے اس پتلے میں حرکت پیدا کی، جو کسی زمانہ میں اپنے وجود، صورت یا نام تک سے آشنا نہ تھا !

اے رحم اور محبت کے مالک ! کیا میں اب بھی تیرے پاؤں کی اس مقدس آواز کو اس رُوئے زمین پر سُن سکتا ہوں، اور کیا تیری تجلیات اب بھی ہوس کی ان تاریکیوں میں رُونما ہو سکتی ہیں۔ کیا وہ روشنی ان مساحد میں بھی دکھائی نہ دیگی ؟

اے خدا ! کیا میں اپنی مبہم اور نامعلوم پرداز سے اس دُن کو نہیں پاسکتا، جو ابھی تک تیرے انتظار میں ہے ؟

اے سراپا رُوح ! اے کہ جس کا عکس کائنات کے ذرّے ذرّے کو حاوی ہے، مجھے اپنے وصال سے مسرت اندوز فرما، مجھے اپنے رحم

لہ قرآن حکیم کی ایک آیت ہے: هَلْ أَتَى عَلَى الْإِنْسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مِّنْ كَوْنٍ اِذْ يَعْنِي: ”انسان پر ایک ایسا وقت نہیں گزر چکا، جبکہ اُس کی پیدائش کے متعلق کوئی سوال بھی نہیں اٹھایا گیا تھا“ فطرت انسانی نے یہاں بھی اس عالمگیر صداقت کو تسلیم کیا ہے ۱۲

اور بخشش کی دُھ جھلک دکھا، جس کے لئے میں دن رات مضطرب رہتا
 رہوں، اور مجھے ان توہمات اور غمِ اندوہ کی تاریک دُنیا سے کھینچ کر خوشی
 اور اطمینان کے اس روشن اور وسیع جہان میں پہنچائے، جہاں راحت
 اپنا بسیرا رکھتی ہے، اور جہاں زندگی کی کٹکٹ کو کوئی دخل نہیں!
 ہاں، صرف اسی جگہ اور صرف اسی مقام پر مجھے پہنچ لینے دے،
 جہاں میں اپنے اس یوسفِ گم گشتہ کا سُرُخ لگا سکوں، اور اس ہمکتے
 ہوئے پھول کو پالوں، جس کا فراق مجھے ہمیشہ خون کے آنسوؤں کا تہ ہے،
 اے خیر فانی زندگی کے مالک، اور اے اس تمام شان و شوکت کے آقا!
 جو تیرے عرش کے نیچے کا رہا ہے، اپنی اُس رُوح پر جو اس نفسِ عنصری
 کے اندر نوحہ کرتے کرتے تنگ گئی، رحم فرما، اور اس قید و بند سے رہائی
 عطا فرماتے ہوئے اس کو ایک ایسی زندگی سے مالا مال کر دے جس کے لئے
 کوئی اختتام نہ ہو۔

لیکن بایں ہمہ رُوح ہے کیا چیز؟۔۔۔ قرآن مجید تو ہمیں صرف اسی قدر
 بتلاتا ہے کہ یَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي؛
 اے نبی! یہ لوگ آپ سے رُوح کی حقیقت دریافت کرتے ہیں، سو کہہ دیجئے
 کہ رُوح میرے پروردگار کا ایک حکم ہے، البتہ اس ضمن میں جو کچھ علامہ
 جلال الدین سیوطی نے فرمایا ہے، اُسے اس اجمال کی بہترین تفصیل کہا جائیے
 اور فی الحقیقت وہ ایک ایسی چیز ہے، جو اپنے فلسفیانہ انداز اور وجدانی
 تجویزوں کے پیش نظر اپنا ثانی نہیں رکھتی، غور سے ملاحظہ فرمائیے:-

فَالرُّوحُ جِسْمٌ حَادِثٌ نُّورَانِي حَيٌّ خَفِيفٌ مُسْرِعٌ النِّسْيَانِ
يَنْفَدُ فِي الْأَعْضَاءِ نَفْوَذَ النَّارِ فِي النِّعَمِ وَكَالْمَاءِ فِي الْأَشْجَارِ

یعنی: ”روح ایک ایسا جسم ہے، جو اپنی مقدس اور نورانی کیفیات کی بنا پر مشاہدہ میں نہیں آسکتا، وہ بجائے خود ایک ابد الابد تک زندہ رہنے والی اور ہلکی پھلکی سی چیز ہے، لہذا مادیات کے ساتھ اسے بہت کم وابستگی ہے، اس کا اعضائے انسانی میں حلول کر جانا بالکل ایسا ہی ہے، جیسے آگ کا کرملوں کے اندر نفوذ کرنا، یا پانی کا درختوں اور بیل بوٹوں کے اندر جاری و ساری ہونا“

مثیلہ نے بھی اس موضوع پر نہایت پاکیزہ خیالات کا اظہار کیا ہے، اور حق تو یہ ہے، کہ اس کا بیان بھی اپنی جدت اور غرولیت کے اعتبار سے مجھے بار بار وجد میں لے آیا ہے، ”روح سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہوں:-

اے روح! تیرا جسم انسانی میں اس طور پر بسیر کر لینا، پسینے اندر دیسی ہی شعریّت، اور وہی سوز و گداز لئے ہوئے ہے، جو کہ خاموش اور مٹی ہوئی بجلیوں میں پایا جاسکے، جو رکھ کے اندر کسی چھپے ہوئے انگائے میں ممکن ہے، ہاں وہی گرمی اور لطافت جو عشق اپنے کسی بچھڑتے ہوئے معشوق کی آخری نگاہوں میں محسوس کر سکے، اور وہی چمک جو کان کے اندر کسی روشن اور انمول ہیرے میں پائی جاسکے!“

تو معلوم ہوا، کہ ”روح سرپا وجدان ہے، اک لطیف شعر ہے، اس لئے شاعرِ فطرت کے علاوہ کوئی دوسرا شخص اس کو سمجھ بھی نہیں سکتا، یہ محسوس

اور مرئی نہیں، اور شعاعِ نظر کی مثل، گو اس سے انسان ہر طرح کی بصیرت اور شعور حاصل کرتا ہے، لیکن بذاتِ خود اسے دیکھ نہیں سکتا، اس مقام پر کیا ہی موزون شعریہ آیا، ذوق کہتے ہیں :

اس سے دیکھا سب کو اور اس کو نہ دیکھا جو نگاہ دہرایا آنکھوں میں دھانسیاں نہاں ہی ہا
 حکمائے یورپ رُوح کو ایک سفید دھوئیں سے مماثل قرار دیتے ہیں
 یہ تشبیہ اپنی ہیئتِ کدائی اور فکر و نظر کی جستجو کو لحاظ رکھتے ہوئے
 کافی حد تک صحیح اور معقول تسلیم کی جا سکتی ہے، میں نے غور کیا، تو
 غالب کے تاثرات کو بھی اسی تھیوری کا مؤید پایا، وہ فرماتے ہیں :-
 شوقِ دیدار میں گر تو مجھے گردن مار ہو نگہِ مثلِ گلِ شمع پریشاں مجھ سے
 جو نہی شمع بجھتی ہے، دہڑاں اک پرکیف اور خمیدہ صورت اختیار
 کرتے ہوئے اوپر کی جانب اٹھتا ہے، لیکن نہیں معلوم کہ ہوا میں اُسے
 اپنی آغوش میں سنبھالے ہوئے کس بہشتِ جاودانی، اور کس
 فرویں بریں تک پہنچا دیتی ہیں !

دیکھ لیجئے، گوشتے کا خیال بھی رُوح کو اسی حیثیت اور اسی تمثیل کے اندر پیش کرتا ہے، وہ کہتا ہے :-

”ایک جلتی ہوئی شمع خواہ کسی ہی ہیئت رکھتی ہو، لیکن وہ زیادہ
 دیر تک کسی بد وضع یا خلافِ حقیقت صورت پر قائم نہیں رہ سکتی
 اور نہ ہی اُسے اس خاکدان کے ساتھ دلی محبت ہے، اس کا شعلہ
 ہمارے دیکھتے دیکھتے زمین سے پرواز کرتا ہے، پھر نظر سے غائب

ہوئے لگتا ہے، اور اسی طرح بالآخر اپنے اصلی مقام اور اپنی جا پیدائش کو بھی پہنچ جاتا ہے۔

بہارِ یَہ مرزا جیسے دقیق سے دقیق مضامین کو انتہائی خوش اسلوبی سے ادا کر جاتے ہیں، اسی طرح سبزہ و بہار کے لطیف اور فرحت بخش تاثرات کو بھی نہایت دل کش انداز میں الفاظ کا جامہ پہناتے ہیں دیوان میں متعدد جگہ ایسی مثالیں ملتی ہیں، ذیل میں چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں، ملاحظہ ہو :-

پھر اس انداز سے بہار آئی کہ ہوئے ہر وہ تماشا نئی
دیکھو اے ساکنانِ خطہ خاک اس کو کہتے ہیں عالم آرائی
کہ زمیں ہو گئی ہے سرتا سر روکش سطحِ چرخِ مینائی
سبزہ و گل کے دیکھنے کے لئے چشمِ زرگس کو دی ہے مینائی

بہار کی شوخی اور سبزہ و گل کی فراوانی اس سے بہتر الفاظ میں نہیں دکھلائی جاسکتی، اور پھر لطیف یہ ہے، کہ بہار کے تماشا نئی بھی ہر وہ ہیں، جو انسانی تکلفات سے دور رہ کر خود اس کے حسن کو دوبالا کرنے والے ہیں، اسی طرح بہار کا نظارہ اس قدر مدہوش کن ہے، کہ اس کی دید کو زرگس کی آنکھوں درکار ہے، جو کبھی جھپکے نہ پائے، حالانکہ یہ بھی خود پھولوں ہی میں سے ایک پھول ہے، پس جو بڑی کیفیت اس بیان کے اندر ہے، وہ یہ کہ شاعر نے حسن و خوبی کے تمام اسباب نیچر ہی کی حدود سے ہتیا کئے ہیں، اور کسی چیز کے لئے بھی باہر قدم نہیں رکھا،

اور پھر :-
 ہے جوشِ گلِ بہا میں یاں تک ہر طرف اڑتے ہوئے الجھتے ہیں مرغِ چین کے پاؤں
 گویا پھولوں کا جال اس طور پر بچھ گیا ہے کہ پرندوں کو بھی ایک
 شاخ سے اڑ کر دوسری شاخ تک جانا دشوار ہو گیا ہے، پھر فرماتے
 ہیں :-

سمجھ اس فصل میں کوتاہی نشوونما غائب اگر گل سرو کی قامت پیراں نہ ہو جاو
 کہتے ہیں، کہ اگر اس دفعہ پھولوں کی کثرت سے سرو بھی ایڑی سے چوٹی
 تک ایک رنگین پوشاک نہ پہن لے، تو سمجھ لینا چاہیئے، کہ گویا کچھ بھی
 پیدا نہ ہوا تھا، یہ بھی قدرت کا ایک عجیب منظر ہے، اسی طرح :-
 پوچھ مت وجہ سیہ مستی اربابِ چین سایہ تاک میں ہوتی ہی ہوا موجِ شراب
 فرماتے ہیں، کہ سرسبز درخت اور چھوٹے چھوٹے میل بوٹے، جو
 مستی کے عالم میں یوں لہلہا رہے ہیں، گویا ایک رند جو بادِ وجود کو شش
 کے خود کو نہ سنبھال سکے، اور بار بار لڑکھڑاتا ہو، تو اس کی وجہ یہ ہے
 کہ انگور کی بیل میں موج ہوا بھی موجِ شراب بن جاتی ہے! :-

گلوں کا لبِ نہر پر جھومنا
 اسی اپنے عالم میں منہ چومنا
 (میر حسن)
 وہ جھک جھک کے گرنا خیابان پر
 نشہ کا ساعِ عالم گلستان پر

شوخی اور ظرافت مرزا کے کلام کا ایک خاص جوہر شوخی اور ظرافت

بھی ہے، لیکن نہ ایسی جو انشاء اور رنگین کی طرح ہزل سرائی اور
غش گوئی کی صورت اختیار کر لے، بلکہ اسیں بھی ایک طرح کی منانت
اور سنجیدگی پائی جاتی ہے، یہ ان کی ایک پیدائشی خصلت ہے، کہ بات
کہتے ہیں، اور اس مزے کی کہتے ہیں، کہ بے اختیار ہنسی آ جاتی ہے چند
مثالیں یہاں پیش کی جاتی ہیں، ملاحظہ ہو :-

حریف مطلب مشکل نہیں فسونِ نیا دُعا قبول ہو یا ب کہ عمرِ خضر دراز
کہتا ہے، کہ ہم دعائیں کرتے کرتے عاجز آ گئے، لیکن دل کا دُعا
پورا نہ ہوا، لہذا اب ایسی چیز کے لئے دُعا کریں گے، جو پہلے ہی سے
دی جا چکی ہو، یعنی بارگاہِ ایزدی میں التجا کریں گے، کہ ”الہی! خضر کو
عمرِ دراز عطا فرما“

ایک اور جگہ کہتے ہیں :-

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پرہت آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا
حشر کے میدان میں خدا کے سامنے کہتا ہے، کہ فرشتوں نے میرے متعلق
جو کچھ لکھا ہے، اُسے بغیر شہادت کے میں کیونکر تسلیم کر سکتا ہوں؟ اور
پھر جب دیکھا، کہ یوں بھی چھٹکارا نہیں ہوتا، تو ایک اور پھبتی سُوجھی،
اور ”برجۃ“ کہہ گئے :-

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی طوداد یا ب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے
یعنی جو گناہ میں نے کئے، ان کی سزا تو مسلم، لیکن قدرت اور اختیار
نہ رکھنے کی وجہ سے جن گناہوں کو میں عمل میں نہیں لاسکا تھا، اور دل کی دل

میں گئی تھی، آخر ان کا بھی تو کچھ معاوضہ ملنا چاہیئے !!
 اسی مفہوم کو ایک اور شعر میں بھی ادا کیا ہے :
 آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمایا مجھ سے مے گنہ کا حساب۔ اے خدا، ہنگ
 یہاں پر بے اختیار خیام کی دُہ رباعی یاد آتی ہے، کہ :-
 ناگردہ گناہ در جہاں کیست بگو آنکس کہ گنہ تکر و چوں زیست بگو
 من بد گنم تو بد مکافات وہی پس فرق میان من و تو چیست بگو
 حق تو یہ ہے، کہ جو شوخی اور برہنگی خیام کی رباعی میں پائی جاتی ہے،
 وہ غالب کے اشعار میں بھی نہیں، کہتا ہے : ٹھہلا بتلا تو سہی ! دنیا میں
 ایسا کون ہوگا، جس نے کبھی گناہ نہ کیا ہو، اور جو شخص گناہ نہ کرے، وہ
 جیئے کیونکر؟۔ میں نے تو برائی کی، لیکن تو بھی اس کا بدلہ برائی ہی سے
 دیتا ہے، (جب حالت یہ ہے) تو پھر میرے اور تیرے درمیان
 فرق کیا ہوا؟“

ایسی باتیں زیادہ تر شاعرانہ ناز و انداز کو مد نظر رکھ کر کہی جایا کرتی
 ہیں، اور انہیں دُہی حیثیت دینی چاہیئے، جو دو بے تکلف دوستوں کی
 گفتگو کو دی جاسکتی ہے !

اسی طرح مرزا کا ایک اور شعر ہے :
 ظاہر ہے کہ گھبرا کے بھالیں گے نکیرین ہاں مئے سولگر بادۂ دوشینہ کی بوئے
 یہاں بھی اسی طبعی ظرافت کا اظہار کیا گیا ہے، پھر زاہد کو مخی طبع
 کرتے ہوئے کہتے ہیں :-

کیوں روّ قح کرے ہے زاہد نے ہے یہ گس کی قے نہیں ہے
 اس کے بعد ایک اور حماقت پر تنبیہ فرماتے ہیں :-
 شیخ جی کعبہ کا جانا معلوم آپ مسجد میں گدھا باندھتے ہیں
 حضرت اکبر کا شعر بھی یہاں لطف سے خالی نہیں، وہ فرماتے ہیں
 کچھ شک نہیں کہ حضرت عظیم بخش شخص یہ اور بات ہو کہ ذرا بیوقوف ہیں
 اس کے بعد مرزا اپنے معشوق سے محاسبہ فرماتے ہوئے کہتے

ہیں :-
 کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا بس چپ ہو ہمارے بھی منہ میں بان ہے
 یعنی ہم چکھ کر بھی بتا دیں گے، کہ فی الواقع تم نے غیر کو بوسہ
 دیا ہے، یا اتنا ردِ علم سے پتہ چلتا ہے، کہ تم اس خیانت کے ترکب ہوئے
 ہو، اور ہم بحث کرنے پر آئے، تو اسے منوا کے چھوڑیں گے، مومن نے
 بھی اس مقام پر غضب کی شوخی دکھائی ہے، چنانچہ انہیں لطائف و ظائف
 سے کام لیتے ہوئے دوست کو ازراہ تشبیہ کہتے ہیں :-

میں ہی تو رہا ہوں کہیں کو خوش و خرم میں ہی تو کی بادہ کشی غیر سے باہم
 میری ہی نظر سے عیاں نیند کا عالم آتی ہے جانی پہ جانی مجھے ہر دم
 انگڑائیاں لیتا ہوں یہ اب میں ہی پیہم میسے ہی تو لرون میں پڑا جاتا ہے کچھ
 میری ہی تو آنکھوں میں غضب نیند بھری ہے
 میری ہی جبین تو ہے جو ٹھٹھنے پہ دھری ہے

میں ہی تو کہیں ات کو بیدار نہا ہوں میں ہی تو ہم آغوش طلب گار رہا ہوں

خانہ سے حسن نے اک روز سوال کیا
 ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دنیا
 جہاں میں کیوں نہ مجھ کو تو لازوال کیا
 شب و روز عدم کا فسانہ ہے دنیا
 ہوئی ہے زبانِ تیرے جب نمودار کی
 کہیں قریب تھا یہ گفتگو کرنے سنی
 سحر نے تارے سحر سحر تیار دی شبنم کو
 بھرائے پھول کے آنسو پیامِ شبنم سے
 چمن سے روتا ہوا موسم بہار گیا
 شباب سیر کو آیا تھا سو گوار گیا

محاکات محاکات کے معنی کسی چیز یا کسی حالت کا اس طور پر ادا کرنا ہے، کہ اس شے کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے، لیکن قبل ازیں کہ ہم مرزا کے کلام پر اس موضوع کے ماتحت بحث کریں، مناسب معلوم ہوتا ہے، کہ ابتداءً چند نہایت ضروری اور اہم چیزوں کا ذکر کر دیا جائے، محاکات حقیقت میں فنِ شعر کا ایک رکن اساسی ہے، کلام کے محاسن اپنی صحیح شکل و صورت میں نمایاں نہیں ہو سکتے، تاوقتیکہ فلسفہ محاکات پر ایک تفصیلی نظر نہ ہو جائے، ہمیں اس ضمن میں یہ بتانا ہوگا، کہ شعرا اور محاکات کا آپس میں کیا ربط اور تعلق ہے، اور اس بنا پر ایک شاعر اور مصور میں کیا فرق ممکن ہو سکتا ہے؟

شعر میں سوز و اثر پیدا کرنے کے جہاں اور بہت سے اسباب ہیں، ایک سبب ان میں سے یہ بھی ہے، کہ قدرتی طور پر جس واقعہ کے دیکھنے سے ہماری طبیعت پر جو اثر یا جو کیفیت طاری ہوتی ہے، اُسے اس

طریق پر بیان کریں، کہ نہ صرف اس واقعہ ہی کی ایک دلکش تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے پھر جائے، بلکہ جو چیزیں اس کے ماحول میں تعلقات اور عوارضات کی حیثیت رکھتی ہیں، وہ بھی ایک ایک کر کے ہمارے سامنے آجائیں؛ جب شعر میں ان باتوں کا التزام کیا جائیگا، تو لازمی طور پر اس میں لطافت اور موسیقی کا پیدا ہو جانا بھی ضروری ہے،

ارسطوؒ نے کتاب الشعر میں اس حقیقت پر جو توجیہ بیان کی ہے، اس کا حاصل بھی ملاحظہ فرمائیے :-

”انسان میں نقالی اور محاکات کا فطری مادہ ہے، جانوروں میں یا تو یہ مادہ مطلق نہیں ہوتا، یا ہوتا ہے، تو کم ہوتا ہے، مثلاً طوطی صرف آواز کی نقالی کر سکتا ہے، بندر حرکات، سکناات کی نقل اتارتا ہے لیکن آواز سے کام نہیں لے سکتا، بخلاف اس کے انسان آواز سے اشارہ سے، حرکات سے، سکناات سے، اور اور مختلف طریقوں سے ہر چیز کی نقل اتار سکتا ہے“

”یہ بھی انسان کی فطرت ہے، کہ اس کو محاکات سے ایک خاص لطف حاصل ہوتا ہے، فرض کرو، اگر ایک بد صورت جانور کی ہو بہو تصویر کھینچی جائے تو ہر شخص کو لطف آئیگا، حالانکہ خود اس جانور کو دیکھنے سے طبیعت مکدر ہوتی، اس سے معلوم ہوا، کہ کسی شے کی محاکات خود لطف انگیز ہے، فی نفسہ وہ شے بری ہو یا بھلی، اور چونکہ شعر بھی ایک قسم کی نقالی اور مصوری ہے، اس لئے خواہ مخواہ اس سے

طبیعت پر اثر پڑتا ہے ۵

گویا ارسطو نے یہ ثابت کیا ہے، کہ انسانی شرف و فضل کی ایک بڑی وجہ واقعات اور احساسات کا صحیح طہر پر اور اک کرنا ہے، اور دیگر حیوانات اس سے یکسر عاری ہیں؛ دوسرے یہ کہ محاکات انسان کی فطرت میں داخل ہے، ظاہر ہے، کہ یہ دونوں چیزیں یعنی قوتِ مدرکہ اور فطرت کا صحیح احساس، جب یکجا کر دی جائیں گی، تو شعر بھی اپنے زور اثر میں لاثانی ہوگا! اب اسی لحاظ سے ایک شاعر اور مصور میں جو فرق ہو سکتا ہے، اُسے بھی ملاحظہ فرما لیجئے؛ حق تو یہ ہے، کہ مصوری بھی بجائے خود شاعری ہی کا ایک اہم جزو ہے، بلکہ جن واقعات کو ایک شاعر الفاظ کے ذریعہ سے پیش کر سکتا ہے، مصور کا قلم ان کی حق ادائی سے بالکل قاصر ہے، بالفاظِ دیگر یوں کہنا چاہیے، کہ ایک چیز کے مشاہدے سے بھی انسان پر وہ کیفیت طاری نہیں ہوتی، جسے شاعر اپنی سحر طرازی سے ایک نئی شان کے ساتھ ہمائے سامنے لاتا ہے، شاعری ایک وسیع قلمرو ہے، اور مصور کو اس کا ایک چھوٹا سا گوشہ دے دیا گیا ہے، اور بس؛ مصور کسی خاص واقعہ یا حالت کو جامہٴ تصویر پر منتقل کر سکے، تو یہ کوئی بڑی بات نہیں، لیکن جہاں تک جزئی اور فروعی کیفیات کا بھی استقصاء کیا جاسکتا ہے، مصور کو آپ بالکل اپنا جج پائیں گے؛ بخلاف اس کے شاعر ایک چیز اور اس چیز کی ایک ایک باریکی اور نزاکت کو بھی انتہائی خوش اسلوبی سے الفاظ کا جامہ پہناتا ہے،

مثال کے طور پر جب ہم ایک مصدقہ کے سامنے اس شعر کو پیش کریں :-
 چہ چشمِ نیم باز عجب خواب ناز ہے فتنہ نو سورا ہے در فتنہ باز ہے
 تو وہ بسہولت تمام مجبوب کی اس خاص حالت اور پوزیشن کو جانتے ہوئے
 پر منتقل کر دیگا، لیکن جب آپ اسی کے سامنے میرا ایس کا یہ بند پیش
 کریں :-

دو دن بے زباں پہ چو تھا آبِ دانہ بند دیا کو ہنہنا کے لگا دیکھنے سمند
 ہر بار کانپتا تھا سمنٹا تھا بند بند چمکاتے تھے حضرت عباس ارجبند
 تڑپاتا تھا جگر کو جو شورِ آبشار کا گردن پھرا کے دیکھتا تھا منہ سوار کا

— تو وہ آپ کا منہ تکنے لگے گا، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میں گھوڑے کی
 تصویر تو کھینچ سکتا ہوں، لیکن اس میں یہ مختلف کیفیات پیدا نہیں کر سکتا
 جنہیں شاعر نے ماحول کے تمام حالات اور واقعات سے متاثر ہو کر ایک
 خاص ترتیب کے ساتھ پیش کیا ہے، گھوڑے کا پیاس کی شدت سے پانی
 کو دیکھ کر بے اختیار ہنہنا نا، پھر اس اضطراب اور تشویش کی حالت میں جسم
 کے ایک ایک عضو کا سمنٹا، اور کانپنا، پھر پانی کی آواز سن کر اپنے سوار کی
 طرف دیکھنا، اور اس طرح سے اپنی بے زبانی پر لاچارگی کا اظہار کرتے ہوئے
 رحم و شفقت کی التجا بھی کرنا، تمام ایسی دل کش اور موثر باتیں ہیں، کہ
 شاعر کے سوا کوئی اور شخص انہیں ادا نہیں کر سکتا!

یامثلہ متاخرین میں سے ایک شاعر سیر کھسار کی تصویر لیں دیکھتا ہے :-

جس کے نظر پر صد فوقِ جنت سے تیار
 گر ہے میں دُوسری جا بہزا رواں بہار
 سنگلاخوں پر میں نے اپنی مستی کو تیار
 دُوسری جا نظر آتے ہیں خشتِ آگار
 کیا عجب ہے خوفِ سی آجائے اسکو بھی بخار
 یعنی اُٹھتی ہیں اسی جا پہ نظریں بار بار
 باغباں قدرت کا دکھاتا ہے پھولوں کی بہار
 اور ان تپوں کی نکلیں سطح میں قطرہ بار
 اُنچی اُنچی چوٹیوں پر لہلاتے مرغزار
 کس قدر آہستہ آہستہ یہ نورانی عباد
 اور پھر ٹپنے لگی چادروں طرف ہلکی سیوا
 کوثرِ مزارج سے یا جئے شیریں کی سیوا
 قلب سے اشجارِ صحرا کے یہ نکلا ہے بخار
 جا رہی ہیں بہرِ عرضِ حال سونے کو گدا
 حسن کو ہی پر یہ پردہ کچھ لپٹے بار بار
 دیکھنا اب فتنہ رفتہ ہو رہا ہے کم غبار
 بس اسی نسبتِ طاہر ہو رہے ہیں سب اجار
 اپنی جزئیات کا کرتی ہر تدریجی اجار
 آہ ہے میں پھر مے پیشِ نظر کوئی سنگار

و فضیلت سے عجیب لطفِ سیر کو ہمار
 الیتادہ میں کروڑوں اک طرف کھوے کیسے پیر
 دیکھتا کیا ہوں کہ صد لچنتہ ہوا کوشری
 اک طرف سر آسماں چھائی ہیں صد ہاتھیاں
 رستمِ دوراں بھی ان غاروں کو گرو کھو بھی
 باوجود اسکے ہی نہیں کچھ عجب بل شبکی
 تخت کو ہی کی طرف دیکھو کہ کس انار سے
 نیم نازک ڈالیوں پر اسے بھی نازت برک
 کس قدر لچپ تھا نظارہ ہنگامِ سفر
 ایک جانب اٹھ رہا ہے قلماے کوہ سے
 رفتہ رفتہ چھالیا اطرافِ وہی میں ہواں
 اسکو میں ناخفی ہوؤں کہتا ہوں تو اسل میں
 یا کہ ابلٹے زمانہ کی زبونی و کجی کر
 یا کہ میں مجتمعِ فرقت کو ماروں گی میں یہ
 یا نظربازوں کی نظروں سے بچانے کیلئے
 الغرض جو کچھ بھی ہو یہ بہت لچنتہ
 جتنہ کم ہونا جاتا رہی یہ نورانی دُہواں
 جس طرح تصویفِ مین مصور کی ملیٹ
 بس اسی صورت سے جتنا ابر ہے کم ہو رہا

اب آپ ہی انصاف فرمائیے، کہ مضمود اس منظر میں وہ تنوع کہاں پیدا کر سکتا ہے، جو ایک شاعر نے کیا، یکے بعد دیگرے اک ایسا ایچ قائم کیا گیا ہے، جو ہر مابعد کی چیز کا از خود پتہ دیتا ہے !

پس شاعر کے حق میں یہی ممتاز خوبیاں ہیں، جن کی بنا پر عارض مجاہد الملک اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتا ہے :-

”مجھے تصاویر دیکھنے کے شیشے جاؤ معلوم ہوتے ہیں، میرے خیال میں سب سے نفیس وہ کمرہ ہے، جس کی تصویر کسی شاعر نے اپنے جاؤ بیان قلم سے کھینچی ہو۔“

پھر واقفکار لوگوں سے مخفی نہیں، کہ گوٹے کا بھی اٹلی کے کھنڈرات کو دیکھ کر یکا یک متاثر ہونا، اور موقلم کو چھوڑ کر اپنے شاعرانہ قلم کو جنبش دینا بھی انہیں وجوہات کی بنا پر تھا، کیونکہ اُس نے بالآخر اس حقیقت کو پایا تھا، کہ شعر جن چیزوں کی ترجمانی کر سکتا ہے، تصویر اُن کا عشرِ عشر بھی بروئے کار نہیں لاسکتی !

اس کے بعد لارڈ مکاکے نے جو کچھ اس بارے میں تحریر کیا ہے، وہ بھی سراسر انصاف اور حقیقت پر مبنی ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں :-

”شاعری جیسا کہ دو ہزار برس پہلے کہا گیا تھا، ایک قسم کی نقالی ہے، جو اکثر اعتبارات سے مصوری، بت تراشی اور نالٹک سے مشابہ ہے، مگر مصوّر بت تراش، اور نالٹک کرنے والے کی نقل شاعر کی نسبت کسی قدر کامل تر

ہوتی ہے، شاعر کی کل کس چیز سے بنی ہوئی ہے؟ الفاظ کے پرزوں سے، اور الفاظ ایسی چیز ہیں، کہ اگر تھوڑا سا ^{طبعی} جیسے متنازع بھی ان کو استعمال کریں، تو بھی سامعین کے متخیلہ میں اشیائے خارجی کا ایسا صحیح اور ٹھیک نقشہ نہیں اُتار سکتے، جیسا موقلم اور جبینی کے کام دیکھ کر ہمارے خیال میں اُترتا ہے، لیکن شاعری کا میدان وسیع اس قدر ہے کہ بُت تراشی، مصوری، اور ناولنگ یہ تینوں فن اس کی وسعت کو نہیں پہنچ سکتے، بُت تراش فقط صورت کی نقل اُتار سکتا ہے، مصوّر صورت کے ساتھ رنگ کو بھی جھلکا دیتا ہے، اور ناولنگ کرنے والا بشرطیکہ شاعر نے اس کے لئے الفاظ ہتیا کر دیئے ہوں، صورت اور رنگ کے ساتھ حرکت بھی پیدا کر دیتا ہے، مگر شاعری باوجودیکہ اشیائے خارجی کی نقل میں تینوں فنون کا کام دے سکتی ہے، اس کو تینوں سے اس بات میں فوقیت ہے، کہ انسان بطون شاعری ہی کی قلمرو ہے، نہ دہاں مصوّر کی رسائی ہے، نہ بُت تراشی کی، اور نہ ناولنگ کی، مصوری اور ناولنگ وغیرہ انسان کے خصائل یا جذبات اس قدر ظاہر کر سکتے ہیں، جس قدر کہ چہرہ یا رنگ اور حرکت سے ظاہر ہو سکتے ہیں، اور یہ بھی ہمیشہ ادھورے اور نظر فریب نمونے ان کیفیات کے ہوتے ہیں، جو فی الواقع انسان کے بطون میں موجود ہیں، مگر نفس انسانی کی باریک گہری اور بوسلوں کیفیات صرف الفاظ ہی کے ذریعے سے ظاہر ہو سکتی ہیں، شاعری کائنات کی تمام اشیائے خارجی اور ذہنی کا نقشہ اُتار سکتی ہے، عالم محسوسات

دولت کے انقلاب، سیرت انسانی، معاشرتِ نوع انسانی تمام چیزیں جو فی الحقیقت موجود ہیں، اور تمام وہ چیزیں جن کا تصور مختلف اشیاء کے اجزاء کو ایک دوسرے سے ملا کر کیا جاسکتا ہے، سب شاعری کی سلطنت میں محصور ہیں، شاعری ایک سلطنت ہے جس کی قلمرو اسی قدر وسیع ہے جس قدر خیال کی قلمرو ۱

محاکات کے موضوع پر اس بیان کی جامعیت ظاہر ہے، شعر کی سبوت اور شاعری کے ممکنات کو اس مقصد کے لئے بے نہایت تسلیم کیا گیا ہے، اسی طرح مولانا شبلی بھی ایک جگہ ان خیالات کا تجزیہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں :-

”ایک بڑا فرق عام مصدّی اور شاعرانہ مصدّی میں یہ ہے، کہ جس چیز کی تصویر کھینچی جائے، اس کا ایک ایک خط و خال دکھایا جائے لیکن شاعر اکثر حالات میں محض ان چیزوں کو لیتا ہے، ۲ اور ان کو نمایاں کرتا ہے، جن سے صرف ہمارے جذبات پر اثر پڑتا ہے، باقی چیزوں کو وہ نظر انداز کرتا ہے، یا ان کو دھندلا رکھتا ہے، کہ اثر اندازی میں ان سے خلل نہ آئے“

اس ابتدائی تقریر کے بعد اب ہم دکھلانا چاہتے ہیں، کہ انہیں صفات اور خصوصیات کی روشنی میں مرزا نے کس خوبی سے اپنے کلام میں محاکات کا حق ادا کیا ہے، مثال کے طور پر جب یہ شعر پڑھا جاتا ہے :-

۱۔ مقدمہ دیوانِ حالی ص ۴

غنچہ ناشگفتہ کو دور مٹ کھا کہ یوں بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھو تبا کیوں
 تو تصور گوش آشنا ہوتے ہی اول در ونداں اور لبِ مرجاں کا نقشہ
 کھینچتا ہے، پھر مسی کی اذابت اور پان کی سُرخ کی ساتھ ان میں تبسم
 کا رنگ بھرتا ہے، پھر رنگاری میں مشغول ہوتا ہے، اور سر سے تحریر
 اور قنقہ کی لکیر تک بھی نہیں بھولتا، اور پھر گردن کے اتار اور سینہ کے
 خطوط کی کشش سے پیکر تیار کرتا ہے، اور اسی پر اکتفا نہیں کرتا، بلکہ
 دستِ حنائی میں جو پردہ ہے، وہ بھی، اور جس غرقہ میں وہ پردہ آویزاں
 ہے، اس کو بھی دکھاتا ہے، اسی طرح دیگر اشعار بھی دیکھ جائیے :-
 پیش طرز دلبری کیجئے کیا کہ بن کہے اُسکے ہر اک اشارہ کی لکھی یہ ادا کیوں
 رات کی بخت چپے ساتھ رقیب لے آئے وہ یاں خدائے پد کے خدا کیوں
 غیر سے ات کیا بنی یہ جو کہا تو دیکھئے سامنے آن بٹھیا اور یہ دیکھنا کہ یوں
 بزم میں اس کے رُہرو کیوں خموش بیٹھے اسکی خاموشی میں بھی ہر پہی کا کیوں
 میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی سنئے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کیوں
 ان میں سے ہر شعر ناز اور شوخی کی تصویر ہے، رویت اگرچہ سب کی
 ایک ہے، لیکن شاعر نے اس ”یوں“ میں بھی ہر جگہ ایک نئی کیفیت اور
 نیا انداز رکھا ہے، ہر شعر بجائے خود ایک بہترین مرقع ہے، اور حسنِ عشق
 کے راز و نیاز کو نہایت دلکش پیرایہ میں ظاہر کرتا ہے، آخری شعر ہی کو
 دیکھئے، کہ معشوق کی شوخی اور ستم ظریفی کو کس انداز سے دکھایا ہے، عاشق
 جب دوست کی محفل میں کسی غیر کو بھی دیکھ پاتا ہے، تو اُسے یہ منظر سخت

ناگوار گزند تلہ ہے، اور کہتا ہے، کہ اسے یہاں سے نکال دینا چاہیے، محبوب اسے جان بوجھ کر کسی اور معنی پر محمول کرتا ہے، اور اس تجاہل عارفانہ کی رُو سے خود معترض کو اپنی بزم سے نکال باہر کرتا ہے، کہ سوائے تیرے یہاں اور کونسا شخص غیر ہو سکتا ہے، کیا یہ جن کی شوخی اور ناز و داد پر ایک بہترین تصویر نہیں ہے، مافیٰ اب و بہرہ کا قلم بھی ان چیزوں کو دیکھ کر شکست کھانے لگتا ہے اسی طرح ایک اور جگہ کہتے ہیں :

در پہلے سے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا جتنے عرصے میں مرا پٹا ہوا بستر کھلا
گو کیا عاشق اس بات کا منتظر تھا، کہ محبوب کی طرف سے کب حکم صادر ہوتا
ہے، کہ ہم اس کے دروازہ پر اپنا ڈیرہ جمائیں، لیکن محبوب کی شوخی دیکھئے، کہ
ادھر اجازت دی، اور ادھر جب دیکھا، کہ یہ بوریا بستر بھی اپنے ساتھ لے آیا ہے،
تو جھٹ انکار کر دیا، اور پھر انکار بھی ایسا کہ بستر کے کھلتے کھلتے اپنے حکم کو
بلار عانت واپس بھی لے لیا گیا، محشوق کا اجازت دینا، عاشق کا خوشی کے
مائے پھولے نہ سنانا، اور جھٹ اپنے پلٹے ہوئے بستر کو کھولنا، اور پھر دوبارہ
محشوق کا انکار کر دینا کہ ایسا نہیں ہو سکتا، اور اس طرح سے اپنے عاشق کی
امیدوں اور آرزوؤں کو حسرت اور مایوسی سے بدل دینا، تمام ایسی باتیں ہیں
جنہیں شاعر ہی کا قلم زیب قرطاس کر سکتا ہے !
محاکات میں بعض اوقات حذف بھی بڑا لطف دے جاتا ہے، مثلاً
مرزا کا ایک اور شعر ہے :

گداسمجھ کے دُھپ تھامری جو شش آئی اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاس لائے

یہ ہم جو بحر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں
پھر خدا خدا کر کے جب قاصد آچکتا ہے، اور وہ مجُوب کا خط اس کے
ہاتھ میں دے دیتا ہے، تو کس طرح وہ اس پر مطمئن نہ ہوتے ہوئے اس کو بدگمانی
اور تحس کی نگاہوں سے دیکھتا ہے :-

دیکھ خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر کچھ تو پیغامِ زبانِ اور ہے
— حالانکہ اس کا منہ دیکھنا محض اس وجہ سے تھا، کہ اس کے چہرہ پر
جو بھر کی اذیت سے مرجھا کر زرد ہو چکا ہوا تھا، خط کے موصول ہونے پر
تازگی، اور فرحت و انبساط کے آثار بھی نمایاں ہوئے ہیں، یا نہیں، پھر
کس طرح وہ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس خط کو کھولتا، اور امید و بیم کی
چند لڑکھڑاتی اور بھٹکتی ہوئی نگاہوں سے اس کو دیکھتا ہے، پھر یہ نگاہیں
کس طرح اُن آنسوؤں سے، جو فرطِ محبت سے مجبور ہو کر آنکھوں کی طرف
اُمنڈ آئے ہوں، چھن چھن کر صفحہ قرطاس پر پڑتی ہیں، جیسے ماہتاب کی
کرنیں کسی چشمہ کو ترین سے گزر گزر کر ایک جنت آباد کئے دیتی ہوں، یا
جس طرح شفق کی روشنی بادلوں کے نقاب کو چاک چاک کرتی ہوئی شام
کی خاموشی میں ایک رنگین اور فرحت انگیز منظر پیدا کئے دیتی ہو، اور پھر
کس طرح آہوں کا یہ سرد پنکھا اپنی ہلکی ہلکی جنبش سے طبعیت کی اس
گرمی اور بے قراری کو آہستہ آہستہ فرو کرتا ہے، جسکو شاعر نے :

ضعف سے گرمیہ مبدل بدم سرد ہوا
سے یاد کرتے ہوئے اپنی بے بسی کا اظہار کیا، پھر کس طرح وہ اس خط کو

بے اختیار چومتا، آنکھوں سے لگاتا، اور دل کی تسکین کے لئے بار بار اسے اپنے سینہ پر رکھتا ہے، پھر کس طرح اس کو چوری چھپے ایک ایک کونے میں بیٹھا ہوا پڑھتا، اور پڑھ کر ہر دفعہ ایک نئی حلاوت محسوس کرتا ہے، پھر کس طرح اس کو ایک معطر اور خوبصورت رومال میں پیٹے ہوئے اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، سفر میں حضر میں، غرض کہ ہر وقت اور ہر حالت میں اپنے ساتھ ساتھ لئے پھرتا ہے، گویا ایک سانس بھی اس کے بغیر جی نہیں سکتا، اور گنج شائگان کے عوض بھی اس کو بیچ نہیں سکتا۔
— ماقبل اور ابجد کی یہ تمام کیفیات صرف اسی ایک شعر کے اندر

فراہم کر دی گئی ہیں !
ایرج کانت دو کلیس کی رائے میں :

”بہترین شعروہ ہے جس کے مضمون کو مصور بلا وقت صغیر قواس سے
جامہ تصویر پر منتقل کر سکے، اور جو حالت خواب تصویر میں قائم تھی، وہ

بیداری سے مبتل نہ ہو۔“

— تو گویا اس تعریف کے مطابق شعریں یہ خصوصیت ہونی چاہیئے،
کہ فرشتوں کے نورانی اور غیر مرئی اجسام کی مثل شعر اگر چہ اپنے عوارضات
اور لطائف کو ایک دھند لکے میں رکھتا ہو، لیکن روحانی اور فطری
تاثرات کی بنا پر اس میں کسی طرح کی کمی نہیں ہونی چاہیئے، اس معیار پر
دیکھا جائے، تو مرزا کے یہ چند اشعار لاثانی ہونگے :-

پھر اس انداز سے بہا ر آئی کہ ہوئے ہر دم تماشا ئی

پیدا نہیں ہوتا، وہ مفرد نکالتا ہے، اور پوسٹ پھینک دیتا ہے، اس کی نظر ہمیشہ اشیا کی رُوح پر پڑتی ہے، اس لحاظ سے وہ معنوی دنیا کا خلاق ہی نہیں، بلکہ پروردگار بھی ہے، بایں ہمہ اسپرئیزہ خیالی، کا الزام عائد کرنا ظلم اور نا انصافی کی انتہا ہے،

ہم اس مطلب کو واضح کرنے کے لئے ذیل میں چند مثالیں نقل کرتے ہیں، جن سے معلوم ہوگا کہ شاعر کا تخیل ایک ہی چیز میں کیا کیا معجزات پیدا کر سکتا ہے:-

پھول ایک ہی چیز ہے، لیکن دیکھئے، کہ اس سے زندگی کی بے ثباتی پر کس کس انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے، غالب فرماتے ہیں:-

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نایاں لگیں خاک میں کیا صوتیں ہوں گی کہ نہا لگیں
یہاں جب شاعر نے لالہ و گل کو دیکھا، تو اسے خیال ہوا کہ زمین جس میں لالہ و حسین خاک سے مل کر خاک ہو چکے ہیں، شاید انہیں کو دوبارہ ان خوشنما اور شادخ رنگین پھولوں کے لباس میں ہمارے سامنے لا رہی ہے، ظاہر ہے، کہ یہ بجائے خود ”حسن تخیل“ اور ”حسن تخیل“ کی ایک نہایت اچھی مثال تھی، اسی طرح جب وہ بہت سے پھول اور غنچوں کو باغ میں دیکھتا ہو تو اس کا تخیل فوراً ایک نئی صورت اختیار کرتا ہے، اور وہ کہتا ہے:-

ہے عدم میں غنچہ جو عبرتِ انجمِ گل
یک جہاں زانو تامل در قفائے خندہ ہے (غالب)

یعنی غنچہ اگرچہ عدم سے عالم بہت و بود میں ابھی نہیں آیا ہے، لیکن

اس کی شکل و عیّت بتلاتی ہے، کہ وہ پھول کی پڑ مرو گی اور ناپائنداری پر
ایک عالم حیرت و استعجاب میں ڈوبا ہوا ہے، اور خیال کرتا ہے، کہ جہاں
کی زندگی ایسی بے مقدار ہو، وہاں میں جا کر کیا کرؤں گا، اسی طرح ستودار
کا ایک شعر ہے :-

بھلا گل تو تو نہنتا ہی ہماری ثباتی کہ بتا روتی ہو کس کی ہستی مہووم پر بنم
شاعر کے تخیل نے پھول کے کھلنے کو اس بات پر محمول کیا، کہ وہ
ہماری بے ثباتی پر ہنس رہا ہے، لیکن جب اسی پر شبم کے قطرات
دیکھے، تو انہیں آنسوؤں سے تشبیہ دیتے ہوئے پھول کے اس
فعل کو باطل قرار دیا، لطف یہ ہے، کہ ایک ہی چیز سے دو متضاد
باتیں ہنسنا اور روننا ثابت کر کے دکھادیں !

اسی طرح اقبال کا ایک شعر ہے :-

پتیاں پھولوں کی گرتی ہیں خزاں میں اس طرح

دست طفل خفتہ سے زبکیں کھلونے ج طرح

یہاں بھی اگرچہ زندگی کی بے ثباتی کو ظاہر کیا گیا ہے، لیکن شاعر کے
تخیل نے حسن تشبیہ میں انتہا درجے کا لطف و اثر پیدا کر دیا ہے،
کہ شعر سے ایک طرح کی معصومیت ٹپکتی ہے، تشبیہ مرکب تشبیہ مفرد
سے ہمیشہ بلیغ اور نادر تر ہوا کرتی ہے، اسی طرح جب شاعر پھول کو
محبوب کے حسن سے منطبق کرتا ہے، تو اس سے جو جو تاثرات
پیدا ہوتے ہیں، انہیں بھی ملاحظہ فرمائیے، اقبال کا ایک

شعر ہے :-

پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ہٹنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو

یہاں شاعر نے جب پھول کو سطح آب پر جھکا ہوا پایا، تو اسی سے
ایک حسین کی شوخی ادا کی طرف تخیل نے رہنمائی کی کہ گویا وہی آئینہ
سامنے رکھے اس میں اپنا عکس دیکھ رہا ہے، اسی طرح میر سبزو کا

ایک شعر ہے :-

دعاویٰ کیا تھا گل نے اس رخ سوزنگ دل کا مایں صبا نے بولیں شبنم نے منہ میں تقو کا
یہاں شاعر حسن محبوب کی فوقیت اور برتری ظاہر کرنا چاہتا ہے، صبا
کے جھونکوں سے گل کی ہٹنی کو ہلتا ہوا پایا، تو خیال کیا، کہ یہ متواتر ضربات
میں، جو محبوب کے سامنے دعوائے جمال کرنے کی وجہ سے پھول پر بطور سزا
پڑ رہی ہیں، اور پھر اسی پر بس نہیں کیا، بلکہ شبنم کو تنوک کے چھینٹوں
پر قیاس کرتے ہوئے اس کے لئے ایک اور تحقیق ثابت کر دی، لطائف جسیہ
اور بلندی تخیل کی یہ بہترین مثالیں ہیں، اسی انداز پر میر کا بھی ایک
شعر ہے :-

کیا خونی اسکے منہ کی اے غنچے نقل کرئیے تو تو نہ بول ظالم تو اتنی ہر دہاں سے
شعراء معشوق کے دہن کو بوجہ تنگی غنچے کے ساتھ تشبیہ دے لیا
کرتے ہیں، کیونکہ ان کے خیال میں معدوم ہونے کی حیثیت سے یہی
تشبیہ اس کے لئے موزوں ہے، اس شعر میں غنچے کے چٹکنے کو اس

کے بولنے سے تعبیر کیا گیا ہے، ظاہر ہے، کہ جب وہ کھلیگا، تو اُس سے بوجہی لازمی طور پر چاروں طرف پھیلے گی، اب شاعر نے ایہام کے طور پر ”دہن“ کے ساتھ صرف ”بو“ کا ذکر کیا ہے، جو اپنے معنی اور قرینے کے لحاظ سے ایک نہایت ناگوار صورت کا نام ہوگا؛ حالانکہ دیکھا جائے، تو یہ حقیقت میں خوشبو ہے، لیکن معشوق کے دہن کی خوشبو اور رنگینی اس قدر بڑھی ہوئی ہے، کہ پھول کی بھی اس کے سامنے کوئی حقیقت نہیں؛ مرزا غالب کہتے ہیں :-

تیرے ہی جلوہ کا ہی یہ دھوکا کہ آج تک بے اختیار دوڑے ہو گل دلفائے گل
شاعر نے جب گلزار میں پھولوں کو یکے بعد دیگرے اس سرعت کے ساتھ کھلتے ہوئے دیکھا، تو خیال کیا، کہ یہ معشوق کے دیکھنے کو اس طرح دوڑے چلے آتے ہیں، اور ان میں سے ہر پھول کو شش کرتا ہے، کہ میں اس کے دیدار میں دوسروں پر سبقت لے جاؤں، اسی طرح ایک اور شعر ہے :

گلشن کو تری صحبت از بسکہ خوش آئی ہو ہر غنچہ کا گل ہونا آغوش کشائی ہے
یہاں غنچہ نہیں کھلا، گویا محبوب کے شوق میں اُس نے اپنے بازو بے اختیار پھیلا دیئے ہیں، ایک اور مقام پر کہتے ہیں :-

بلبل کے کاروبار پہ ہنسنے کی وارفتگی اور بے تابی کا سبب قرار
یہاں پھولوں کے ہنسنے کو بلبل کی وارفتگی اور بے تابی کا سبب قرار دیا، اور تجنیل نے حسن و عشق کے باہمی تعلقات پر ایک اور نتیجہ استخراج

کیا ہے، پھر کہتا ہے :

غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل گم کیا ہوا دیکھا خوں کیا ہوا پایا
اس جگہ شاعر پھول کو کھلتے ہوئے دیکھتا ہے، تو خیال کرتا ہے، کہ
یہ شاید میرا ہی دل ہے، جسے میں ایک مدت سے کھو بیٹھا تھا، اور جسے کسی
کی جفا کاری اور بے رحمی نے زخمی کر دیا ہوا ہے !

اب اس حیثیت سے بھی قطع نظر دو ایک مثالیں اور ملاحظہ ہوں،
آتش کا ایک شعر ہے :-

زیریں مڑا تا ہے جو گل سوز رکھتے قاروں نے راستہ میں لٹا یا خزانہ کیا؟
پھول میں جو زرد رنگ سا ریزہ ہوتا ہے، اُسے ”زیر گل“ کہا کرتے
ہیں، شاعر کی نظر جب اس پر پڑی، تو سمجھا کہ ”قاروں“ جو خزانے سمیت
زمین میں دھنسا دیا گیا تھا، شاید اسی نے اب اپنی فیاضی اس قدر عام کر
دی ہے، کہ پھول بھی زمین سے مالا مال ہو کر نکلتا ہے،

اقبال کہتے ہیں :-

سُورج نے جاتے جاتے شام سیہ قبا کو طشتِ افق سے لیکر لالے پھول کے
شام کو ایک دلہن قرار دیا ہے، جس نے سیاہ رنگ کا لباس پہن رکھا ہو
پھر فرماتے ہیں، کہ سورج کے غروب ہوتے وقت کنارِ آسمان پر جو شفق
پھیل جایا کرتی ہے، اس سے لالے کے چند پھول لے کر اس دلہن کو
ہنسی اور مسخر کے طور پر پائے گئے، یہاں نخل نے ایک خارجی چیز سے
پھول لئے اور لے کر کس خوبی اور رعنائی سے انہیں استعمال میں لایا !

یہاں تک پھول کے متعلقات سے بحث کی گئی، اب اسی متنوع کو مد نظر رکھتے ہوئے ہلال پر دو ایک شعر پیش کئے جائے جاتے ہیں، علامہ اقبال فرماتے ہیں:-

ٹوٹ کر خوشید کی کشتی ہوئی غرقاب نیل ایک ٹکڑا تیرتا پھر رہا ہے رو آب نیل
طشتِ گردل میں ٹپکتا ہوا شفق کا خونِ نیا نشرِ قدرت کیا کھولی ہر قصہ آفتاب؟

چرخ نے بالی چالی ہے عروسِ شام کی؟

نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیمِ قلم کی؟

پہلے شعر میں نیل نے ماہِ نو کو اس ٹکڑے سے مشابہ قرار دیا ہے، جو خوشید کی ڈوبتی ہوئی کشتی سے ٹوٹ کر سطحِ آب پر تیرتا ہوا رہ گیا ہو، دوسرے شعر میں پھر اسی ٹکڑے کو ایک نشتر سے تعبیر کیا ہے، کہ اس نے آفتاب کو، جس کا چہرہ صفراء کی وجہ سے زرد ہو چکا تھا، فصدا کیا اور کرتے ہی اُس کا خونِ آسمان پر پھیل گیا؛ تیسرے شعر میں پھر وہی نشتر ایک بالی قراپائی، جسے آسمان نے شام کی دلہن سے چرایا ہو، اور پھر نیل کے پانی میں وہی بالی چاندی کی ایک خوبصورت مچھلی بن گئی ہے!

یہ تمام تشبیہات اپنی اپنی جگہ خوب ہیں، لیکن اسی پر شاہ نصیر کی ایک تشبیہ بھی ملاحظہ فرمائیے، آپ ایک دفعہ تحصیلدار سونی پت کے پاس ملاقات کو گئے، اور کچھ زنگترے دلی سے بطور سوغات ساتھ لے گئے، تحصیلدار نے کہا، کہ ان زنگتروں کی حسن تشبیہ میں کوئی شعر

ارشاد فرمائیے، اُسی وقت رباعی کہی اور سنائی :-

لے نیر بُرج آسمان اقبال ان رنگتروں پر غور سو کبھی گھبرا
یہ نندِ حقیر ہو قبلِ خاطر پردہ میں شفق کے ہنر گرہ بند ہلال
اسی طرح شاعر جب ہلال سے ملتی جلتی چیز جگنو کو رات کی تاریکی
میں کہیں دیکھ پاتا ہے، تو اس کی جھک بھی تجل میں یہ تیزی اور سرعت پیدا
کرتی ہے، کہ وہ بے اختیار پکار اٹھتا ہے :-

جگنو کی روشنی ہے کا نشانہ چمن میں یا شمع جل ہی، پھولوں کی انجمن میں؟
آیا ہے آسمان سے اُڑ کر کوئی ستارہ یا جان پڑ گئی ہے ہبتا کی کرن میں؟
یا شب کی سلطنت میں ن کا سفیر آیا؟ غربت میں آ کے چمکا، گننام تھا وطن میں
تکمر کوئی گول ہے ہبتا کی قبا کا؟ ذرہ ہی بانمایاں سورج کے پیر میں؟

حسنِ قدیم کی یہ پوشیدہ اک جھلک تھی؟
لے آئی جس کو قدرت خلوت سے انجمن میں

اسی طرح سورج و ریا ایک ہی چیز ہے، لیکن اس پر بھی شاعر کا تجل
جو نیرنگیاں پیدا کر سکتا ہے، اُس کی ایک جھلک ملاحظہ ہو، میر انیس فرماتے ہیں :-
پیاسی جو تھی سپاہِ خدا بینِ رات کی ساحل سے سر ٹپکتی تھیں موجیںِ فرات کی
موجوں کا ساحل سے سر ٹکرانا فی الحقیقت اس طلاطم کی وجہ سے ہے،
جو روانی کے وقت لہروں میں پیدا ہو جایا کرتا ہے، لیکن شاعر نے
”حسنِ تحلیل“ سے کام لے کر اس کا سبب یہ بتلایا، کہ اہل بیت چونکہ کئی
روز سے پیاسے تھے، اور انہیں پانی کہیں بھی میسر نہیں آیا تھا، اسلئے

موجیں ان تک پہنچنے کے لئے مضطرب اور بے قرار ہو رہی ہیں،

اسی طرح ایک اور جگہ فرماتے ہیں :-

ڈر سے ہوا فرات کی موجوں کو اضطراب اور آب میں سڑوں کو چھپانے لگے حجاب
ظاہر ہے کہ یہاں بھی اُسی حسن بیان اور حسن انداز سے کام لیا گیا ہے
لڑائی اس زور کی ہوئی کہ موجیں بھی خون سے تھر تھرانے لگیں، حجاب ادھر
جنگ کا یہ تماشا دیکھتے اور ادھر فوراً ڈر کے مارے پانی میں غوطہ لگا لیتے
تھے، اقبال کا ایک شعر ہے :-

ہو دلفریب ایسا کسار کا نظارہ پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھا ہو
یہ بھی حسن تعلیل کی ایک بہت اچھی مثال ہے، یہاں موج کا اٹھنا
سیر کسار کے لئے ہے، اسی طرح موج کی اس حرکت کو شاعر کے تخیل
نے جب مذہبی نقطہ نظر سے دیکھا تو کہا :-

فوقاٹم ربط ملت سے ہے ہنہا کچھ نہیں موج ہی دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں
موج اُسی وقت تک موج ہے جب تک اُسے دریا کے ساتھ چوستگی
حاصل ہو، لیکن جہنمی یہ رشتہ ٹوٹا، تو پھر وہ بھی ایک بے حقیقت سی چیز
رہ جائے گی، اسی طرح فرد کی عزت بھی ملت کے نظام پر موقوف ہے !
پھر جب اسی موج کو علائق دیوبی اور عوارضات انسانی پر قیاس
کیا گیا، تو تخیل نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا :-

کشا کشائے ہستی سے کسے کیا سعی آزادی
ہوئی زنجیر موج آب کو فرصت روانی کی (غالب)

یعنی موج جس قدر بھی قید ہستی سے رہائی پانے کی کوشش کرتی ہے
 اُسی قدر خود اُس کی رفتار ہی اس کے پاؤں میں بیڑیاں جکڑ دیتی ہے، یہی
 حال غریب انسان کا ہے، کہ وہ دنیا کے جھگڑوں سے جتنا بچکر اردو امن
 سمیٹ کر چلتا ہے، اُسی قدر یہ خاردار جھاڑیاں اُسے اپنے قابو میں لے آتی،
 اور آگے بڑھنے سے باز رکھتی ہیں!

اس کے بعد جب شاعر نے موج کو علی اور اخلاقی حیثیت سے مفید
 پایا، تو اس سے ایک اور بات استنباط کی،

موجیم کہ آسودگی ماعدم ماست زندہ بہ آنیم کہ آرام نگیں ہم
 موج اسی وقت تک زندہ ہے، جب تک وہ متحرک بھی ہے، لیکن
 جو نہی وہ اس جدوجہد سے دست بردار ہوئی، ساتھ ہی مدوم ہو کر رہ جائیگی،
 اسی طرح جو لوگ اس دنیا میں زندہ رہنا چاہتے ہیں، ان کے لئے بھی لازم
 ہے، کہ وہ کچھ کام کریں!

اس بحث نے بھی کسی قدر طول پکڑ لیا، الغرض اب ہم ناظرین سے
 پوچھنا چاہتے ہیں، کہ آپ نے شاعر کے تخیل اور اُس کی وسعت کو ملاحظہ فرمایا؟
 کہ وہ کس طرح زندگی کے روزمرہ تاثرات میں ایک ہی چیز سے کئی کئی
 نتائج پیدا کرتا، اور کس طرح انداز کی خوبی سے بیان میں ایک معنائی سی
 کشش بھرتیا ہے، پس اس کے بعد وہ باقی ماندہ مثالیں بھی نقل کر دی
 جاتی ہیں، جو تخیل کے زیر عنوان مرزا کے کلام سے ہمارے پاس
 موجود ہیں :-

محبوب کی نسبت کہتے ہیں :-
 ہو گئے ہیں جمع اجزاء نگاہ آفتاب ذلے اس کے گھر کی دیواروں رون میں
 دوست کے گھر چلے گئے ہیں، اور اتفاق سے دیواروں کے روزن میں
 اُن بے تاب اور منتشر ذریں کو بھی دیکھ پایا ہے، جو آفتاب کی شعاؤں
 میں رقص کناں اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر آتے جاتے ہیں، پس تجسّیل
 نے اس سے یہ دلیل پکڑ لی، کہ آفتاب بھی ان تمام فیوض و رجحان آریٹوں
 کے باوجود ہمارے محبوب کے حُسن کا دیوانہ ہے، اور اسی لئے وہ اپنی
 شمعِ نظر سے کاشکی لگاٹے دیکھ رہا ہے، اسی انداز پر ایک اور شعر ہے :-
 قید میں یقوب نے کی گو نہ یوسف کی خبر لیکن آنکھیں روزن دیوار زندان نکلیں
 فرماتے ہیں، کہ حرام نصیب باپ اگر چاہے بیٹے یوسف کی زنداں میں
 خبر نہ لے سکا، لیکن اُس کی آنکھیں اپنے تختِ جگر کے فراق میں روتے روتے
 نابینا ہو گئیں، اب اس خیال کو یوں ادا کیا ہے، کہ جو روزان دیوار زندان
 میں دکھائی دیتے ہیں، وہ گویا حقیقت میں یقوب کی وہی نابینا آنکھیں
 ہیں، جو اپنے پیٹے کی طرف نگراں ہیں، اور انہوں نے یہ صورت اس لئے
 اختیار کی ہے، کہ اُس نازنین کا دم جس سے گھٹنے نہ پائے، اور انہیں
 سوراخوں سے وہ باہر کا تماشا بھی دیکھ سکے !
 ایک اور جگہ کہتے ہیں :-

نہ چھوڑی حضرت یوسف نے بھی خانہ آرائی
 سفیدی دیدہ یقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

یہ بھی حسن تخیل کی ایک بہترین مثال ہے، بیان کیا جاتا ہے، کہ جب زلیخا نے خفا ہو کر یوسف کو زنداں میں بھجوا دیا، تو ساتھ ہی داروغہ کو بھی حکم بھیجا کہ :-

مطر دار دیوار و درخش را
منور ساز طاق و منظرش را (جامی)

اس فرمان کے مطابق اس محبس کی تزیین کی گئی، اب شاعر کی طبع رسائی اس واقعہ سے یوں استدلال کیا، کہ یعقوب کی آنکھوں سے جو سفیدی آنسوؤں کے ذریعہ سے بہ رہی ہے، اُنہی سے قسطنطنیہ کی دیواریں روشن کی جا رہی ہیں، جس کی شان یہ ہو، اس پر زلیخا کا اس طرح جان دینا اور زمانِ مصر کا فرط حیرت سے انگلیاں کاٹ بیٹھنا کچھ عجیب نہیں !

پھر کہتے ہیں :-

گھر ہمارا جوتے بھی تو ویراں ہوتا بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیا باں ہوتا
مرزا کو اس جدید جغرافیائی تحقیق کا کیا علم تھا، لیکن اسے تخیل کی داد سی اور شاعر کی بلند نظری کہا چاہیے، کہ اُس نے آج سے تقریباً نصف صدی پیشتر اس مسئلہ کو یوں ادا کر دکھایا ہے، کہ آج بڑے بڑے فلسفی بھی اس خیال کو اس حسن انداز اور اس شانِ بلاغت کے ساتھ پیش نہیں کر سکتے، کہتا ہے، کہ میرے احباب جو مجھے یہ طعنہ دیتے ہیں، کہ تیرے پیہم اور مسلسل گریہ نے اس گھر کو ویراں کر دیا ہے، انہیں

معلوم نہیں، کہ اگر میں نہ بھی رونا، تو اس گھرنے اسی کا اسی طرح ویران
 ہی رہنا تھا، اس لئے کہ ازل ہی سے اس کی قسمت میں ویرانی کے سوا
 اور کچھ نہیں لکھا ہے، پھر اس کی دلیل یہ دی ہے، کہ جہاں اب سمندر ہے
 اگر یہ نہ بھی ہوتا، تو اس کی جگہ صحرا اور بیابان ہوتا، پس جب دونوں ویرانی
 میں ایک جیسے ہیں، تو شک کا کس بات کی؟
 ایک اور جگہ فرماتے ہیں :-

صفت یہ تبدل بد مسمود ہوا باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا
 سائنس کی تحقیق ہے، کہ پانی بخارات بن کر ہوا میں اڑ جاتا ہے،
 چنانچہ دیکھنے میں آیا ہے، کہ دیگھی کا ڈھکنا اٹھانے سے بخارات اوپر کو
 اُٹھتے اور پھر آہستہ آہستہ نظر سے غائب بھی ہو جاتے ہیں، مرزا نے
 اپنے رنگ میں اس کی تصدیق یوں کی کہ روتے روتے جب آنسو خشک
 ہو گئے، اور نالہ و فریاد کا آغاز ہوا تو فرمایا ع

”باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا“

ایک فلسفی بھی کیوں اسے تسلیم نہ کر لے کہ آنسوؤں کی گری نقامت
 کی وجہ سے سرد ہوا میں منتقل ہو گئی ہے؟

پھر فرماتے ہیں :-
 آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی صدا ہر کوئی دراندگی میں نالہ سنا چا رہے
 کون نہیں جانتا، کہ آگ سے پانی ڈالتے وقت صدا اٹھاتی ہے،
 یہ روزمرہ دیکھنے کی باتیں ہیں، لیکن شاعر کے تخیل نے اس سے یہ نتیجہ

پیدا کیا، کہ انسان بھی وہی درو کی حالت میں اسی طرح نالہ و فریاد کرنے پر مجبور ہے، اور یہ فطرت کا ایسا قانون ہے، جس سے کوئی شے بھی آزادی کا دعویٰ نہیں کر سکتی !

اسی طرح ایک اور شعر ہے :

توفیق باندازہ ہمت، ازل سے آنکھوں میں وہ قطرہ ہے کہ گویا نہ ہوتا تھا
یہ ایک اخلاقی اور عملی سبق ہے، فرماتے ہیں کہ دنیا میں جس قدر کسی کا ظرف ہوتا ہے، اُسی قدر وہ اکتساب ہنر بھی کر سکتا ہے، اور قدرت نے ہر انسان کو اُس کے حوصلے اور ارادے کے مطابق توفیق بخشی ہے؛ اب نہ وہ اس سے زیادہ کر سکتا ہے، نہ کم، چنانچہ تم دیکھتے نہیں، کہ جن قطرہ نے موتی بننا گوارا نہیں کیا تھا، قدرت نے بھی اُسے انسانی آنکھ جیسی برگزیدہ اور متبرک جگہ عنایت کی ہے، جہاں سے کبھی تو وہ حب قومی میں بہتا ہے، کبھی ایک حسین کے رخصا پر ڈھلکتا ہے، جیسے پھول پر شبنم کے قطرات، اور کبھی خوفِ خداوندی سے اس میں یہ شان پیدا ہوتی ہے، کہ :
موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لئے قطرے جو تھے مے عرقِ انفعال کے
اور اسی طرح :-

زندگی قطرے کی سکھلاتی جو اسرارِ حیات یہ کبھی گویا کبھی شبنم کبھی آنسو ہوا
— اب قطرے کے یہی مختلف مدارج ہیں، جو اس کے حوصلے کی وسعت یا کمی کو ظاہر کرتے ہیں، اور زندگی کا قانون جب ہر حالت میں ترقی اور فوقیت ہی ہے، تو پھر ہمت بھی اس کی تحصیل میں کسی طرح کی سستی

یا کوتاہی کا موقع کیوں پیدا ہونے دے :-

دما دم نقشہائے تازہ ریزد بیک صورت قرار زندگی نیست
اگر امروز تو تقدیر دوش است بختاک تو شرار زندگی نیست
پس غور کیا جائے، تو انہیں خصائص کے پیش نظر غالب نے بھی اپنے
شعر میں ایک ایسے عقدے کو حل کر کے رکھ دیا ہے، جو انسانوں کے لئے
ہمیشہ سے وجہ انتشار چلا آتا تھا، اور وہ عقدہ مسئلہ تقدیر کا ایک
نہایت عمدہ اور تسلی بخش حل ہے، اس موضوع پر غالب کا شعر
بجائے خود لاثانی ہے۔ — انداز بیان کی ندرت اور رفعت تخیل پر
آپ سے آپ داد دیتا ہے، لیکن اقبال نے بھی اس کی نسبت
کوئی کمی باقی نہیں رہنے دی کچھ اشعار آپ دیکھ چکے، باقی ذیل میں
ملاحظہ فرمائیے :-

ارضیاں نقد خودی در باختند نکتہ تقدیر اور انشا خند
رمز بار کیش بحر فی مضمر است تو اگر دیگر شوی اد دیگر است !
خاک شوندر ہو اس از ترا سنگ شوبہ شمشہ انداز ترا !
شبنمی؟ افتندگی تقدیر تست قلزمی؟ پائندگی تقدیر تست !
تخیل کی بحث نے یہاں خاتمہ پایا، اب ہم دوسرے عنوان کو لیتے

ہیں *

نویسیقی اور ترنم موسیقی بھی شعر کا ایک نہایت ضروری جزو ہے،
جبکہ بالکمال شاعر ہوئے ہیں، ان سب کے کلام میں موسیقی پائی جاتی ہے

مناسب معلوم ہوتا ہے، کہ یہاں مغربی شعراء کے چند اقوال بھی بطور اقتباس پیش کر دیئے جائیں، جن سے معلوم ہوگا، کہ دنیا کے تمام شاعر اس کئے تاثرات اور خوبیوں پر کس طرح، ہم آواز اور متفق دکھائی دیتے ہیں :-

موسیقی فرشتوں کی زبان ہے ، (لانگ فیلو)

موسیقی ٹوٹے ہوئے دل کی دوا ہے ، (سرلے ہنٹ)

کوئی دل ایسا ہے جو موسیقی کو سُن کر

بہ نہ نکلے ، (بی بی ٹی)

آسمان کی وہ چیز جو زمین پر ہے ، (ایڈلسن)

موسیقی ہوا کی شاعری ہے ، (رچرڈ)

اگر انسان کے کان ہوں ، تو ہر چیز میں

موسیقی موجود ہے ، (باغرن)

(مرزا نے بھی یہی کہا :-

محرم نہیں ہے تو لوہا، راز کا یاں در نہ جو حجاب ہے پردہ ہر ساز کا)

تمام مصنوعی چیزوں کو اپنی اپنی جگہ نمائش کر لینے دو،

لیکن رُوح کی ترجمانی تو موسیقی کے علاوہ اور کسی

شے سے نہیں ہو سکتی ! ، (شرل)

مَدھم اور بے کیف صدائیں تو بے شک فراموش

کر دی جاتی ہیں، لیکن موسیقی کے لطیف تاثرات

ہمارے دماغ سے کبھی محو نہیں ہوتے، (شیلے)

مجھے مرتے وقت موسیقی سنا دو، اس سے زیادہ مسرت کی مجھے تلاش نہیں، (کیٹس)

شاعر کے اس مصرعہ کو میں کلمہ ایمان سمجھتا ہوں، کہ: وہ جن کو خدا سے محبت نہیں ہوتی، ان کو موسیقی سے محبت (ٹی مارلے)

نہیں ہوتی۔
آپ شکسپیر کی نظمیں پڑھیے، تو ایسا معلوم ہوگا، کہ موسیقی بھی خود بخود پیدا ہوتی چلی جاتی ہے، یہاں صرف تامل ہی پایو کا کام دیتا ہے، انگریزی میں تو خیر بحر اور قافیہ و ردیف وغیرہ کا التزام ضروری نہیں سمجھا جاتا، لیکن مشرقی شاعری میں یہ چیزیں موسیقی کے لئے خاص طور پر معین ثابت ہوتی ہیں، عروض میں بعض اوزان ایسے ہیں، کہ موسیقی ان سے از خود پیدا ہوتی ہے، فارسی میں قافائی کی تمام شاعری ایسے ہی نغموں سے معمور ہے، ہر شعر میں سُر اور تال ساتھ ساتھ پیدا ہوتے ہیں، اردو میں بھی مومن اور واغ کے ہاں بعض بعض جگہ یہ جھلک دکھائی دیتی ہے، اور غالب کا تو کلام ہی سراپا موسیقی ہے، مرزا نے بحریں ایسی اختیار کی ہیں، جو بجائے خود ترنم ریز ہیں، اور پھر قافیہ و ردیف کا انتخاب اس کے علاوہ ہے، یہاں مثال کے طور پر دو ایک غزلیں پیش کی جاتی ہیں، ملاحظہ ہو :-

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
 یاد تھیں ہلکے بھی رنگا رنگت م آرائیاں
 تھیں نبات النعش گردوں و گلہرو پر نہیں
 قید میں یعقوب نے لی گونہ یوسف کی خبر
 سب قیدیوں سے ہوں ناخوش پر زبان مہر سے
 جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ جویم فری
 ان پر زار دہلے لیں گے خلد میں ہم مقام
 نین سستی ہو دماغ اسکا ہر اہل سکی ہیں
 میں چن میں کیا گیا گویا دبستان کھل گیا
 وہ نگاہیں کیوں ہوتی جاتی ہیں باہر دل پا
 بسکہ روکامیں نے اور سینہ میں ابھر رہے ہیں
 واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جوتا
 جانفزا آبادہ جسکے ماتھے میں جام آ گیا
 ہم مودہ میں ہمارا کیش ہی ترک سوم
 رنج سوخو گر ہوا انسان تو مٹ جاتا رنج

خاک میں کیا صوفیوں کی کہ نہاں ہو گئیں
 لیکن اب نقش و نگار طاق نسیان ہو گئیں
 شب کو آنکھوں میں کیا آئی کہ عریان ہو گئیں
 لیکن آنکھیں رزن دیوارِ نعل ہو گئیں
 ہر زلیخا خوش کہ مجھ ماہ کنساں ہو گئیں
 میں نے سمجھو لگا کہ شمعیں دوزخاں ہو گئیں
 قدرت حق سے یہی حویریں اگر واں ہو گئیں
 تیری زلفیں جس کے باؤ پر پریشان ہو گئیں
 بلباہیں سکر مے نالے غزلخواں ہو گئیں
 جو مری کوتاہی قسمت مٹ گاں ہو گئیں
 میری آہیں بجیہ چاک گریباں ہو گئیں
 یاد تھیں غنیمت دعائیں صرف دریاں ہو گئیں
 سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگباں ہو گئیں
 ملتیں جب مٹ گئیں اجڑا ایمان ہو گئیں
 مشنگیں مجھ پر پڑیں تنی کہ اسان ہو گئیں

یوں ہی گرد و مار غالب تو اے اہل جہاں
 دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

اس غزل کا ہر شعر اس قدر مترنم ہے کہ ہر بار طبیعت میں ایک وجد
 سا پیدا ہونے لگتا ہے، اور پھر مرزا نے قافیہ ایسے اچھے اختیار کئے ہیں

کہ ان کی نظیر نہیں، آج کوئی ایک شعر بھی ایسا کہہ کر تو دکھائے !
یہاں ایک بات خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے اور وہ یہ کہ جب کسی شاعر کو کوئی
اچھا اور دلپسند قافیہ دستیاب بھی ہو جائے تو ہمیشہ اسکو تخیل کے زیر اثر رکھنا چاہئے، ورنہ
اگر اس کا خلاف کیا گیا، یعنی تخیل کو قافیے کا محکوم بنا دیا گیا، تو نہ صرف شعریں ایک ادرو کا سا
رنگ پیدا ہو جائیگا، بلکہ لازمی طور پر وہ موسیقی اور ترنم سے بھی عاری رہیگا !

اس کے علاوہ کبیروں شاعر ہی ایسا برق شمال اور سریرح البطحہ نہ ہو،
کہ قافیہ اس سے بلا وقت خود بخود بندھ جائے ؟ اور کیوں وہ اس کیلئے
کسی اچھے خیال کی تلاش نہ کر تا پھرے ؟ کیا اس سے فن کا عجز اور شاعر کا
افلاس ثابت نہیں ہوتا ہے ؟ میں کہتا ہوں کہ ایک گھوڑا کتنا ہی شورخ
اور سرکش کیوں نہ ہو، لیکن جب اُس کا سوار اپنے بازو میں کافی سے زیادہ
قوت رکھتا ہو، تو اُس کی مجال نہیں کہ وہ اپنا صحیح راستہ چھوڑ کر کسی اور
راستہ پر بولے، وہ نتیجہ کار اس کو مسخر کر ہی کے چھوڑے گا !

مرزا نے اپنے کلام میں جگہ جگہ ایسا ہی بے ساختہ پن دکھایا ہے،
چنانچہ اس معیار پر ایک اور غزل ہے :-

مکتہ چلے غم دل اُس کو سنا نہ بنے	کیا بنے بات جہاں بات بنائے بنے
میں بلاتا تو ہوں اُس کو مگر مجھ سے دل	اس سے بچائے کچھ ایسی کہ بنائے بنے
کھیل سمجھا ہی کہیں چھوڑ دے بھول جائے	کاش یوں بھی ہو کہین میر سنائے بنے
غیر بھرتا ہے لہو یوں تیرے خط کو کہ اگر	کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے بنے
اس نزاکت کا براہ وہ بھلے ہیں تو کیا	ہاتھ آویں تو انہیں ہاتھ لگائے بنے

کہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی؟ پردہ چھوڑا ہے وہ اُسنے کُٹھا ہے
 موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے ہے تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے
 بوجہ دوسرے گرا ہے کُٹھا ہے اٹھے کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے
 عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
 کہ لگائے نہ لگے اور سمجھائے نہ بنے

اسی طرح ایک اور غزل کے چند اشعار ہیں :

دل سے تری نگاہ جگرتاں اتر گئی دونوں کو اک ادا میں رضا مند گئی
 شوق ہو گیا ہے سینہ خوشالذاتِ فراق تکلیف پردہ دار میں زخم جگر گئی
 دیکھو تو دلفریبی اندازِ نقش پا مورج خرام یا رہی کیا گل کتر گئی
 ہر لبو لبوس نے حسن پرستی شواکی اب آبروئے شیوہ اہل نظر گئی
 نظا ہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا مستی سے ہر نگہ تے رخ پر بھر گئی
 — دیکھی آپ نے قافیوں کی چسپیدگی؟ اور دیکھی آپ نے تخیل کی
 بلند پروازی؟ صدیقی اور معنوی محاسن کا سلسل اسی طور پر قائم رہتا
 ہے، کہ ہر ہر لفظ کے ساتھ موسیقی نشے کی طرح دل و دماغ پر چھا جائے،
 اور خواب رنگین کی مثل رُوح کی تمام کلفتوں کو زائل کر دے، کیا شعر
 اس کے بغیر بھی تکمیل کے درجہ تک پہنچ سکتا ہے، مانا کہ ایک
 معنی ساز کی بد سے شعر میں موسیقی پیدا کر دے گا، لیکن غور کیا جائے
 تو اس کا یہ فعل ایک خارجی حیثیت رکھتا ہے، جب تک شعری بجائے خود
 اپنے اندر وہ تمام کیفیات اور وہ تمام خواص مضمر نہ رکھتا ہو، جو ساز کے

ایک ایک تار میں پوشیدہ ہیں، تو پھر ایسا شعر کہنے سے فائدہ ہی کیا؟
 اور پھر ایسے شعر کو ہم شعر کا خطاب کس لئے دیں؟
 اس جگہ آپ کو یہ بھی معلوم ہو جانا چاہیئے کہ شعر بجائے خود کتنا ہی
 ترنم ریز کیوں نہ ہو، لیکن اس میں جو چیز سب سے زیادہ موسیقی کا عنصر پیدا
 کر دیتی ہے، وہ فی الحقیقت انسان کا ذاتی وجدان ہے، قدرت نے ہمارے
 کانوں کی تشکیل اور بناوٹ ہی میں ایک ساز کے سے خواص جمع کر دیئے
 ہیں، لہذا جو آواز بھی کسی کے ہونٹوں سے اُٹھتی ہے، قوتِ سامع اس کو
 بالکل اسی صورت اور اسی ہیئت میں قبول نہیں کر لیتی، بلکہ ہوا کی لہریں
 اس آواز کو لئے ہوئے جیسے ہمارے کان تک پہنچتی ہیں، تو کان کے پردے
 اس کو بلیغوت قبول کرنے کی بجائے پہلے منتشر کر لیتے ہیں، پھر ان میں سے
 ہر پردہ اپنی اپنی جگہ ایک جدا گانہ کیفیت کا حامل ہے، جو دوسرے میں
 نہیں پائی جاتی، اور اس طرح سے وہ آواز موسیقی کا بیشتر حصہ انہیں
 ذرائع سے حاصل کرتی ہوئی ایک نازک اور لطیف پردے سے جا کر
 ٹکراتی ہے، اور ہمیں سنائی دیتا ہے، لیکن بنو زریہ آواز بھی ہمارے لئے
 جہل اور بے معنی تھی، پھر جس نے ہمیں اس کا مفہوم سمجھایا، وہ ہماری
 قوتِ مدِ رک ہے، جس کا احساس دماغی اعصاب کرتے ہیں، جہاں تک
 میں نے غور کیا، موسیقی کو اخذ کرنے میں تمام انسانوں کی قوتِ مدِ رک یکساں تھی
 ہے، ہاں اس سے متاثر ہونے اور اس وجدان کی تکمیل کے لئے جس کا
 ذکر میں نے ابتداء میں کیا، قوتِ حاسہ ایک نہایت ضروری چیز ہے اس کا

تعلق انسانی دل سے ہے، اور سب میں یکساں طور پر نہیں پائی جاتی، یہ قوت جس شخص میں جتنی زیادہ پائی جائے گی، اُسی قدر وہ موسیقی کے والہانہ لطائف سے زیادہ محظوظ ہو سکیگا، اور سچ پوچھو تو ہمارے پاس یہی ایک ایسا معیار ہے جس کی رو سے ہم ایک شاعر اور غیر شاعر میں امتیاز کرتے ہیں!

موسیقی کے انہیں تاثرات پر یہاں ایک بات نقل کرتا ہوں، جو مناسب مقام ہونے کے علاوہ کسی طرح بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی، پچھلے دنوں ایک دوست نے مجھ سے بیان کیا، کہ ایک دفعہ بمبئی میں کسی امیر زادے کے ہاں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا، خوش گلو ہونے کے علاوہ دولتِ حسن سے بھی مالا مال تھا، دیر تک گفتگو ہوتی رہی، پھر ستارہ بنتے میں لی، اور میری پیٹھ ٹھونک کر پورے ادعا سے کہنے لگا: ”بیجے مولانا! ایک طرف میرا گانا سنئے، اور دوسری طرف بارش کا نزول دیکھئے“ میں نے اوپر کو نظر اٹھائی تو مطلع بالکل صاف تھا، لہذا اس اندھی بات پر مجھے بے اختیار ہنسی آگئی، اور ان سے کہا ”میاں ہوش میں آؤ، مطلع بالکل صاف ہے، ستارے جگمگ جگمگ کر رہے ہیں، سہلا بارش کیونکر ہو سکتی ہے“ — ”اچھا تو پھر دیکھتے رہئے گا!“ آشنا کہا اور ستار چھٹیڑ دی: رات کی خنکی، موسم کی شگفتگی اور پھر رگ کی مستی، نعمت و سرو کا ایک بے پناہ تموج، واللہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، کہ بادل کے ٹکڑے چاروں طرف سے گھر گھر کر ہمارے سروں پر

جھا گئے، اور پھر اسی دوران میں بارش بھی ہونے لگی، اور اس قدر ہوئی، کہ گلی کو پچے بہہ نکلے، ساری زندگی میں اتنا حیرت انگیز اور مبہوت بنا دینے والا واقعہ میں نے آج تک نہیں دیکھا، میں نے کہا ”دوست! اتنی پہلے آتا دیکھ کر یہ پیشین گوئی ”کر دی ہوگی“ آج کل جھوٹے اور شعبدہ بانسپیروں کی داستانیں تو بہت سننے میں آتی ہیں، کہیں نقالی یا دل لگی کا شوق تو نہیں چرایا؟“ نہیں! ہرگز نہیں!! یہ سب موسیقی کے اثرات ہیں۔ ایک تیز و تند اور غیر تمدنہ جواب تھا،

میں نے یہ سن کر کہا کہ بھئی، تمہیں اس واقعہ پر تعجب ہے، میں جب رقت کے عالم میں غالب کی مخصوص غزلوں پر نغمہ سرائی کرتا ہوں تو آسمان سے ”باران نور“ برستی ہوئی دکھائی دیتی ہے، فرشتے اپنے سفید بازو پھیلا کر چاروں طرف سے احاطہ کر لیتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روح القدس کا نزول ہوا ہے، اور عالم کا ذرہ ذرہ اس موسیقی سے مدہوش ہو کر وجد کرنے لگتا ہے، تمہیں اس بارے میں ”علم الیقین“ بھی حاصل نہیں، اور مجھے خدا کے فضل سے ”حق الیقین“ حاصل ہے!

پھر میں نے اس خاص واقعہ کی تعبیر کرتے ہوئے انہیں بتلایا، کہ نفسیاتی اصولوں کی بنا پر بھی برسات اور موسیقی میں ایک گہری مناسبت ہے، اور رقت حاسہ کی تیزی یہاں بھی اپنا اعجاز دکھاتی ہے، چنانچہ تم نے دیکھا ہو گا، کہ اب بھی ہندوستان میں اس موسم کے شروع ہوتے ہی نوخیز اور حسین لڑکیاں دھتوں میں جھولے ڈال کر بعض گانے جو اسی

حالت اور اسی موقع کے لئے مخصوص ہیں؛ گانا شروع کر دیتی ہیں، طبعی حیثیت سے یہ چیز ان کے لئے گویا وقت کی انتہائی مسرت ہے ایک توجوانی، دلوں میں ارتعاش پیدا کر دینے والے ولولے، آرزوؤں کی بھو مار، اسپر نغمے کی عطر بیزی؛ جذبات میں کیونکر ایک قیامت خیز، ہیجان پیدا نہ ہوگا، اور پھر یہ ہیجان کیونکر اپنے جذب و کشش ہی سے بادلوں کے دل کے دل انگٹھے کر لینے پر قادر نہیں!! اس کے علاوہ جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے، نقفس کا بھی اپنی موسیقی کے سونہ میں جل کر راکھ ہو جانا، اور پھر بارش ہی سے دوبارہ زندہ ہونا، اسی مناسبت کی بنا پر ہے، قدرت نے ان اجزاء کو معنوی طور پر کچھ اس طرح سے تحلیل کر دیا ہے، کہ وہ ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے، اور ان کا یہ باطنی فعل ہی حقیقت میں بقائے عالم کا سرمایہ دار ہے؛ دوست کو میری تعبیر بہت پسند آئی، اور تعریف میں مشغول ہو گئے،

تشبیہیں اور استعارات اردو شاعری میں تو خاص طور پر یہ

نقص چلا آتا ہے، کہ جو تشبیہیں یا استعارے مقدماتی نے وضع کئے تھے بعد والوں نے انہیں پر اپنی بنائیں استعاریں، اور کسی جدت کا پیدا کرنا گناہ سمجھا، چنانچہ بقول مولانا حالی مشق کی صورت کو چاند سورج یا جنت سے، آنکھ کو زکس یا دام یا بیمار سے، برد کو کمان یا محراب سے، مڑھ کو تیر سے، لبوں کو نبات یا آب حیات سے، منہ کو غنچہ سے، کمر کو بال سے اور دونوں کو عدم سے مشابہ قرار دینا مخصوص اور لازم ہو گیا، لیکن ہم

دیکھتے ہیں، کہ مرزا کا دامن اس عیب سے بھی پاک ہے، وہ اس بارے میں لکیر کے فقیر نہیں ہیں، بلکہ دیگر صفات کی طرح یہاں بھی وہ ایک مجدد اور مجتہد کی حیثیت رکھتے ہیں، مبتذل تشبیہوں اور ہیچودہ مناسبات سے غالب کو قدرتی طور پر نفرت تھی، اس نے دوسروں کی تقلید کو اپنے معیار بن کیلئے ایک بدترین عیب تصور کیا، اُس کا عقیدہ تھا، کہ اوروں کی دبی ہوئی چیز ہی پر فراعنت کر لینا انسانی شرف کو مٹانا اور فطرت کے حقیقی کمالات کو غارت کرنا ہے، یہی وجہ ہے، کہ قدرت نے اُسے ایک ایسی تحسینی قوت عطا کی، جو آج تک کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی، ہم یہاں مثالیں دیکر اس حقیقت کا ثبوت پیش کرتے ہیں، ملاحظہ ہو، چکنی ٹولی کے لئے کیسی کیسی عمدہ اور ناور مناسبات پیش کی ہیں :-

زیب تیاہو اسے جتھرا چھا کہئے	ہے جو صاحب کفوت پر چکنی ٹولی
ناطقہ سر بگربیاں کہ اُسے کیا کہئے	خامہ نگشت بدنداں کہ اُسے کیا لکھئے
حرز بازوئے سکر فافاں خود آرا کہئے	مہر مکتوب عویزان گرامی لکھئے
واغ طرف جگر عاشق شیدا کہئے	مسی آلودہ سر نگشت حیناں لکھئے
سرستان پر زیاد سے مانا کہئے	خاتم دست سلیمان کے مشابہ لکھئے
نافہ آہوئے بیابان فتن کا کہئے	جہر الاسود دیوار حرم کیجے فرض
رنگ میں سبزہ نوخیز سیجا کہئے	وضع میں اُس کو سمجھ لیجئے قافیاق
میکدی میں اُسے خشت خم صبا کہئے	صومعہ میں اُسے ٹھہرائے گر نماز
کیوں اسے نقطہ پر کار تمنا کہئے	کہوں اسے قفل دبر گنج محبت لکھئے

کیوں اسے گہر نایاب تصور کیجے کیوں اسے مرد مک دیدہ عمقا کہئے
 کیوں اسے مکمل پیرا بن لیل لکھئے کیوں اسے نقش پے ناتہ سما کہئے
 بندہ پرور کے کف دست کو دل کیجے فرض
 اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہیئے

پھر فرماتے ہیں :-

دہم ہر موج میں حلقہ صد کا ہر رنگ دیکھیں کیا گندے ہی قطر پہ گہر ٹوٹا نک
 اس شعر میں موج کو دام اور مگر کے منہ کو، تو دریاؤں میں اس کثرت سے
 ہوتے ہیں، اُس دام کے حلقوں سے تشبیہ دی گئی ہے، ظاہر ہے کہ یہ بھی
 اپنی طرز کی ایک بالکل نادر اور اچھوتی تشبیہ ہے، اسی طرح :
 جوئے خون آنکھوں سے بہنے دو کہ شامِ قرین میں یہ سمجھو لگا کہ شمعیں دو فروزا ہو گئیں
 یہاں آنکھ سے جو خون بہتا ہے، اُسے ایک روشن شمع سے تعبیر کیا گیا
 ہے، اس میں وجہ شبہ دونوں کی لمبی حرارت اور رنگ کی سرخی ہے،
 پھر کہتے ہیں :-

پس از مردن بھی دیو نہ زیارت گاہِ طفا مان نثار سنگ نے تربت پیر کی گلفشانی کی
 اس جگہ چنگاریوں کو پھولوں سے تشبیہ دی گئی ہے، اسی طرح دوسری
 جگہ اپنے زخموں اور خون کے دھبوں کو پھولوں سے :-

وعدہ سیر گلستان خوش طالع شوق مژدہ قتل مقدس ہے جو مذکور نہیں
 گویا :-

انہیں منظر اپنے زخمیوں کا دیکھ آتا تھا اُٹھے تھے سیر گل کو دیکھنا شوخی بہا کی

اس کے بعد :-

حاصل الفت دیکھا جز شکستِ آرزو دل بدل ہویتہ گیا ایک لبِ افسوس تھا
ایک دل کو دوسرے دل کے ساتھ ملانے سے جو صورت پیدا ہوتی ہے
اُسے یہاں اُن مونٹوں سے تشبیہ دی گئی ہے، جو افسوس کی حالت میں
کھلے کے کھلے رہ گئے ہوں، مقصد یہ کہ :-

دہر میں نقشِ وفا دجہِ تسلی نہ ہوا ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندہ معنی نہ ہوا

پھر :-
پرتوِ خور سے ہر شبِ نیم کو فنا کی تسلیم میں بھی ہوں ایک عینیتِ نظر سے ہم
اس شعر میں محبوب کو آفتاب اور خود کو شبِ نیم قرار دیا ہے، پہلی تشبیہ
میں دجہِ شبِ حسن و خوبی کا اظہار ہے، اور دوسری میں اپنی کمزوری اور
ناتوانی کو ثابت کیا ہے، کہ آفتاب کے پرتو سے شبِ نیم خود بخود کافور ہونے
لگتی ہے،

پھر فرماتے ہیں :-

جادو رہ خور کو وقتِ شام ہوتا شعاعِ چرخِ واکر ہے ماہِ نوسِ آغوشِ وداع
اس شعر میں تارِ شعاع کو جادو رہ سے تشبیہ دی ہے، اور پھر ماہِ نو
کو اُس آغوشِ وداع سے تعبیر کیا ہے، جو دن کے سیفر یعنی سورج کو
رخصت کرنے کے لئے آسمان کی طرف سے واکر دی گئی ہو،

پھر فرماتے ہیں :-

ہے مجھ ابر بہا ہی کا برس کر کھلنا روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا

یعنی میں دوست کے فراق میں اُسی طرح سے رو رو کر فنا ہو جاؤں گا جس طرح بہار کے موسم میں بادل برستا ہے، اور اس قدر برستا ہے، کہ نتیجہ کار اس کا نام نشان باقی نہیں رہتا، ظاہر ہے، کہ یہ بھی ایک نہایت عمدہ اور نادر تشبیہ ہے،

پھر فرماتے ہیں :-
 میں زوالِ آمادہ اجزا آفرینش کے
 مگر گدوں، چراغِ بگزارِ بادیاں
 مقصد اس شعر سے دنیا کی بے ثباتی کو ظاہر کرنا ہے، یہاں کی ہر چیز فانی ہے، پھر مثال یوں دی کہ آفتاب جو تمام دنیا کو روشنی پہنچاتا ہے، وہ بھی اس چراغ کی حیثیت رکھتا ہے، جو ہوا کے رنگدہ پر رکھا ہو، ظاہر ہے، کہ وہ نتیجہ کار ہوا کے ایک ہی جھونکے سے بچھ جائیگا، اسی طرح آفتاب بھی دو گھڑی کا ہمان ہوتا ہے، پھر ایک اور جگہ فرماتے ہیں :-
 رنگِ مَلِکینِ گلِ لالہ پریشاں کیوں ہے
 گر چراغانِ سرِ رنگدہ باد نہیں
 مضمون وہی ہے، لیکن یہاں صرف تشبیہات کو بدل دیا گیا ہے یعنی گلِ لالہ اور چراغان میں رنگ کی مماثلت اور عمر کے، میج ہونے میں جو مناسبت ہے، اُسے ظاہر کیا ہے، ایک اور جگہ کہتے ہیں :-
 خنائے پائے خزاں، بہار اگر ہے یہی
 دوامِ کلفتِ خاطر ہے عیشِ دنیا کا
 اس جگہ ”بہار“ کو خنائے پائے خزاں سے مماثل بیان کیا ہے، بہار جب آتی ہے، تو اپنے ساتھ چمن میں اک عجیب رنگینی لاتی ہے، ایسی طرح ہندی کا رنگ بھی بہار کا ایک جلوہ اپنے اندر لئے ہوئے ہے، تو

کہتے ہیں، کہ جس طرح خنا کا رنگ دیکھتے ہی دیکھتے اُڑ جایا کرتا ہے، اسی طرح بہار کو بھی ثبات نہیں، کہ اس کے گزرتے ہی پھر خزاں کا دور آ جاتا ہے، یہاں وجہ شبہ بے ثباتی اور رنگِ ہیت کی باہمی مماثلت ہے!

پھر :-

یاد کردہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا انتظارِ صید میں اک دیدہ بیخواب تھا
یہاں محبوب کی زلفوں کو دام سے اور ان میں جو کُنڈل ہوتے ہیں،
انہیں اس دام کے حلقوں سے تشبیہ دی گئی ہے، پھر کہتا ہے، تجھے
یاد نہیں، جب کہ اس دام کا ہر حلقہ عشاق کے دل چھیننے کے لئے
ایک دیدہ بیخواب کی مثل ہر وقت کشادہ رہتا تھا، پھر آج تجھے اپنے
اسیروں کی پروا کیوں نہیں، اسی مفہوم کو دوسری جگہ یوں ادایا

ہے :-

حلقے ہیں چیمپا کشادہ بسو کول ہر تارِ زلف کو نگہ سرمہ سا کہوں
یہاں تشبیہ میں ایک اور جدت پیدا کی، اور حلقوں کو چیمپا کشادہ
سے تعبیر کرتے ہوئے زلف کے ہر بال کو ان آنکھوں کی نظر قرار دیا، وہ
نظر جو سرمے کی وجہ سے اپنے اندر زہریلے تیر کا سا اثر رکھتی ہے،

پھر کہتے ہیں :-

نشہ شادابِ نازِ دامنِ مستِ طرب شیشہ مے سرو سبز جو تیارِ نغمہ ہے
مخلِ خوب گرم ہو رہی ہے، دور چل رہا ہے، نشہ دل و دماغ میں
اک عجیب شادابی پیدا کرتا ہے، آلاتِ موسیقی میں سے جو چیزیں

موجود ہیں، وہ بھی گویا خوشی کے عالم میں رقص کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں،
حتیٰ کہ شراب کے شیشے بھی اپنی جگہ سے اُچھل اُچھل پڑتے ہیں :-
ہیں بسکہ جو بنِ بادِ سی شیشے اُچھل رہے ہر گوشہ بساطِ ہے سر شیشہ باز کا
— شاعر اسی حالت میں بیٹھے بیٹھے حسنِ تشبیہ سے سبزہ و بہار کا
تماشا بھی دکھاتا ہے، اور کہتا ہے، کہ نغمہ ہوا کی لہروں میں ایک حسین
ندی کی شل بہتا ہے، اور شراب کی جو صراحیاں رکھی ہیں، یہ گویا سرو ہیں، جو
ہرے رنگ کا لباس پہنے ندی کے کنارے اس کی زینت کو دو بالا
کر رہے ہوں،

ایک اور جگہ فرماتے ہیں :-

ہے آرمیدگی میں نکویش بجا مجھے صبحِ وطن ہے خندہ دندانِ نا مجھے
”خندہ دندانِ نا“ نکویش یعنی ملامت کے لئے بھی بڑا کرنا ہے بیان
کرنا یہ مقصود ہے، کہ میں جو آرام سے وطن میں بیٹھا ہوں، تو ہر روز
جب بھی صبح کی سفیدی نمودار ہوتی ہے، تو وہ گویا ایک خندہ دندانِ نا
سے مجھے ملامت کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے، کہ یہاں ہاتھ پر ہاتھ دھرے
کس لئے بیٹھا ہے، باہر نکل اور دنیا کے کسی کام کا ج میں مصروف
ہو، اسی انداز پر ایک اور جگہ کہتے ہیں :-

نکویشِ ناعِ بے بطنی شو جنوں آئی بڑا ہو خندہ احبابِ بخیمہ جیبِ دہن میں
یہاں دوستوں کا ہنسنا بھی ملامت ہی کے لئے ہے، کہتا ہے،
کہ دوستوں کے ہنسنے سے جنوںِ عشق کے جو انداز تھے، اُن میں کسی قدر

کی آگئی ہے، یعنی اب میں اپنے جیب و دامن کو چاک نہیں کرتا، انسان جب ہنستا ہے، تو دانت صاف دکھائی دیتے ہیں، انہیں کو یہاں بجیٹے سے تشبیہ دی ہے، کہ اس میں بھی ٹانگے دانتوں ہی کی طرح ایک دوسرے کے بعد ابھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں !
دانتوں ہی پر ایک اور نادر تشبیہ یاد آئی، لہذا اسے بھی دیکھتے چلے :-

یاد ہے شادی میں بھی ہنگامہ باریب سبجہ زائد ہوا ہر خندہ زیر لب مجھے
اس شعر کا مطلب یہ ہے، کہ میں فارغ البالی اور عیش و سرور کی حالت میں بھی اپنے پروردگار کو نہیں بھولا ہوں، لیکن خوبی یہ کہ خندہ زیر لب کو سبجہ زائد سے تعبیر کرتے ہوئے اپنی ہنسی ہی سے ذکرِ الہی کو بھی ثابت کر دیا، جو ایک طور پر محبت اور شکر گزاری کی دلیل ہے،
حقیقی زائد ریاکاری سے ڈرتے ہوئے اپنی تسبیح کبھی کسی کو نہیں دکھلایا کرتے، اور اسے دامن ہی کے نیچے چھپائے کچھ نہ کچھ پڑھتے رہتے ہیں، اس لحاظ سے تشبیہ کی اس انتہائی مماثلت پر غور فرمائیے،
کہ شاعر نے کس احتیاط سے اس کو ”خندہ زیر لب“ جیسی نازک اور لطیف ترکیب سے یا د کیا ہے،

اگر اسی جگہ خندہ زیر لب کی جگہ خندہ دندانہ استعمال میں لایا جاتا، تو تشبیہ ناقص ہی نہیں، بلکہ سراسر باطل تھی !
پھر کہتا ہے :-

ہاتھ دھو دل سے ہی گرمی گزاند لیتے ہیں آہ بگینہ تندی صبا پہ گھلا جاتا ہے
 اس شعر میں اپنے دل کو آہ بگینے سے اور گرمی خیال کو تندی صبا سے
 تغیر کیا ہے، مطلب یہ کہ اگر فکر میں تیزی کا یہی عالم رہا تو میرا کمزور
 اور نحیف دل اس کی تاب نہیں لاسکیگا،
 پھر کہتا ہے :-

جنت پہ میری عرصہ آفاق تنگائی دریا زمین کو عرق انفعال ہے
 یہاں دریا کو زمین کے عرق انفعال سے یاد کیا گیا ہے، وہ مرزا کی
 وسعت جنوں کے لئے ناکافی ثابت ہوئی اس لئے شرمندگی سے
 پانی پانی ہو گئی ہے،
 پھر فرماتے ہیں :-

نہیں ہے زخم کوئی بخیمہ کے درخورد مرین ہو، تارا شکایت اس شستہ چشم منوں میں
 یہاں سوئی کے ناکے کو آنکھ سے اور تار کے کو ان مسلسل آنسوؤں
 سے تشبیہ دی گئی ہے، جو اس آنکھ سے بہتے ہوں، وجہ آنسو بہنے
 کی یہ ہے، کہ زخم بہت زیادہ خراب ہو چکے ہیں، اور سینے کے قابل
 نہیں رہے، اس لئے سوئی بھی حسرت اور یاس کے عالم میں روتی
 ہے،!

پھر کہتے ہیں :-
 دل دیدن نقد لاسانی سحر سودا کیا ہے کہ اس بازار میں ساغر متاع دست گرداں ہے
 اس شعر میں ساغر کو متاع دست گرداں سے تشبیہ دی ہے،

منارِ دستِ گرواں وہ ہے، جو ایک ہاتھ دی جائے، اور دُسرے
ہاتھ لی جائے؛ ساتی بھی اس وقت تک ساغر نہیں دیتا، جب تک
دل و دیں بیک وقت اُس کے حوالے نہ کر دیئے جائیں،
پھر فرماتے ہیں :-

دُرکار ہے شگفتنِ گلہائے عیش کو صبح بہارِ پنبہ مینا کہیں جسے
یہاں "صبح بہار" کو پنبہ مینا سے تشبیہ دی ہے، وجہ شبہ نگ
کی سفیدی اور معنی کی لطافت ہے، اس لئے کہ مینا بجائے خود مجملہ
ان اسباب کے ہے، جو عیش و تنعم کی حالت میں استعمال کئے جاتے
ہیں، پھر بہار کا تماشا اس کے علاوہ ہے، اسی انداز پر ایک اور شعر
یہ ہے :-

بجلی ہے گرنہ سُنے نالہ ہائے بلبلِ زار کہ گوشِ گلِ شبنم سے پنبہ آگیا ہے
یہاں پھول کو کان سے اور شبنم کے روشنی قطرات کو روئی سے
مشابہ قرار دیا ہے، اور کہتے ہیں، کہ پھول جو بلبل کی آہ و پکار کو نہیں
سنتا، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اُس نے اپنے کان میں روئی ٹھونس
رکھی ہے،

پھر فرماتے ہیں :-
قطرہ مے بسکہ حیرت سے نفس پر بڑھا خطِ جامِ مے سراسرِ شتہ گوہرِ ہوا
محبوب کے لبِ مرجاں کو دیکھ کر شراب کے قطرے اس حد تک
متحیر ہوئے، کہ یکے بعد دیگرے منجمد ہو ہو کر موتیوں کی صورت اختیار

کرتے چلے گئے، حتیٰ کہ جام کے اندر جو خط تھا، وہ بھی جواہرات کی ایک نایاب لڑی بن گیا، اسی مفہوم کے پیش نظر ایک اور جگہ فرماتے ہیں :-

کے ہوا بدہ تے لب سے کسنگ فروغ خط پیالہ سرا سر نگاہ گلچیں ہے
گلچیں کی نظر ہر وقت پھولوں کی سُرخ اور رنگینی ہی میں محو رہا
کرتی ہے، اسی طرح خط پیالہ نے بھی جب اس شوخ کے ہونٹوں
کو دیکھا، تو سراپا نگاہ گلچیں بن گیا !

پھر فرماتے ہیں :-
اسدِ مٹھنا قیامت قاتلوں کا قتلش لباسِ نظم میں البیدین مضمونِ عالی ہے
یہاں بھی صرف تشبیہ ہی میں ندرت پیدا نہیں کی بلکہ شعریت
اور تغزل کو بھی اس شان سے نمایاں کیا ہے، کہ پڑھتے ہی طبیعت
پر کیف طاری ہو جاتا ہے،
پھر جب آفتاب کی حسن تشبیہ میں گوہر افشانی فرماتے ہیں، تو
کہتے ہیں :-

صبح آیا جانب مشرق نظر اک نگار آتشیں رخ سر کھلا
تقی نظر ندی کیا جب رد سحر بادہ گل رنگ کا ساغر کھلا
لا کے ساتی نے صبوحی کے لئے رکھ دیا ہے ایک جام زر کھلا
ستاروں کی نسبت کہتے ہیں :-
خسرو انجم کے آیا صرف میں شب کو تھا گنجینہ گوہر کھلا

سطح گردوں پر پڑا تھا رات کو موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا

اسی طرح ایک اور شعر ہے :-

شبِ تونی پھر انجمِ خشنده کا منظر کھلا اس نکتے سے کہ گویا تنگدستی کا دکھلا
تنگدستی میں رات کو چراغاں کیا جاتا ہے، اور وہ ایسا معلوم ہوتا
ہے، کہ گویا ستارے بکثرت جگمگا رہے ہیں، مرزا نے اسی مناسبت سے
ستاروں کو چراغاں سے تشبیہ دی ہے،

مرزا کا ایک خاص کمال یہ ہے، کہ جہاں وہ کسی مبتذل یا
فسودہ تشبیہ کو استعمال میں لاتے بھی ہیں، تو اس پیرائے سے کہ
اس میں بجائے بدمزگی کے ایک دلاویز جدت پیدا ہو جاتی ہے،
مثال کے طور پر :-

تیرے میرے وحشی کو وہی زلف کیا ہاں کچھ اک رنج گرانباری زنجیر بھی تھا
زلف کو زنجیر سے تشبیہ دینا ایک نہایت مبتذل اور پامال سا
مضمون ہے، لیکن یہاں جس خوبی کے ساتھ اسے چسپاں کیا گیا ہے،
وہ دیکھنے کی چیز ہے،

اسی طرح ایک اور شعر ہے :-

کم نہیں نازش ہمتانی چشمِ خوباں تیرا بیمار کیا ہی گر اچھا نہ ہوا
آنکھ کو شعراء بیمار سے تشبیہ دیتے چلے آتے ہیں، لیکن مرزا
نے حسن انداز سے اس میں بھی جدت کا ایک خاص رنگ نمایاں
کر دیا ہے، ایک اور شعر ہے :

دہان ہر بت پیخارہ جو زنجیر رسوائیؑ
 عدم تک بیونفا چاہے تیری یونفا کی کا
 معشوق کے دہن کو مودوم تسلیم کیا جاتا ہے، شاعر کہتا ہے، کہ ادبے فغا!
 تیری بے وفائی اور جفا کاری کے چرچے آج حسینوں کی زبان پر ہیں، وہ
 ایک دوسرے سے اس کا ذکر کرتے ہیں، اور اس طرح تیرے لئے
 رسوائی کا ایک ایسا سلسلہ قائم ہو گیا ہے، جس کی آخری کڑیاں عدم
 سے جا ملتی ہیں، ظاہر ہے، کہ یہاں بھی تشبیہ اگرچہ پامال ہی تھی، لیکن
 شاعر کی نغز گوئی سے معافی میں ایک نئی شان پیدا ہو گئی!
 غالب کا دیوان الیسی اور اس سے بھی اچھی تشبیہات سے معمور
 دکھائی دیتا ہے، لیکن چونکہ اس بحث نے بھی قدسے طول پکڑ لیا ہے، اس
 لئے ہم اشعار نقل کرنے کی بجائے اب صرف اشارات ہی سے کام
 لیتے ہیں :-

چنانچہ موئے آتش دیدہ کو زنجیر سے، دانہ لٹے تبیح کو صد
 دل عشاق سے، جو ہر آئینہ کو طوطی بسمل سے، ہر قطرہ خون تن کو
 نیگین نام معشوق سے، پارہ لٹے جگر کو نعل بیش بہا سے، ناخن کو
 ابرو او ہلال سے، سرمہ کو دود شعلہ آواز سے، نالہ کو گردش سیارہ
 کی صدا سے، حلقہ گرداب کو شعلہ جوالہ سے، موئے شیشہ کو دیدہ ساغر
 کی خزاں سے، سایہ شاخ گل کو انفی سے، جام زرد کو داغ پلنگ
 سے، سپیدہ صبح کو جوئے شیر سے، آئینہ کو درطہ سے، مون شراب
 کو مژہ خواب ناک سے، دہر ہونڈا مائل بیان کیا ہے،

اب تو آپ پر بخوبی واضح ہو گیا ہوگا، کہ غالب تشبیہات و استعارات وغیرہ کے اختراع میں بھی بجائے خود ایک مجدد اور خلاق کی حیثیت لکھتا ہے، اور جب تک شاعر میں فی الواقع یہ جذبہ پیدا نہ ہو، وہ حقیقی معنوں میں شاعر کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا، بلکہ ایسی حالت میں اسے ایک نقال اور محض دوسروں کا آلہ کار تصور کیا جائے گا : جس طرح ایک پتلی ناچتی ہے، لیکن اسے معلوم نہیں ہوتا، کہ میں کس کے ہاتھوں پر ناچ رہی ہوں !

الفاظ اور ترکیبیں | الفاظ اور معانی کے باہمی ربط کو واضح کرنے کے لئے کتاب العہد میں باب فی اللفظ والمعنی ایک خاص عنوان قائم کیا گیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے :-

”لفظ جسم ہے اور مضمون روح ہے، دونوں کا ربط باہم ایسا ہے جیسا روح اور جسم کا ارتباط، کوہ کزد رہوگا، توبہ بھی کزد رہوگی، پس اگر معنی میں نقص نہ ہو اور الفاظ میں ہو، تو شعور میں عیب سمجھا جائیگا، جس طرح لنگر ٹھے یا لنگے میں روح موجود ہوتی ہے، لیکن بدن میں عیب نہ ہوتا ہے، اسی طرح اگر لفظ اچھے ہوں، لیکن مضمون اچھا نہ ہو تب بھی شعر خراب ہوگا، اور مضمون کی خرابی، الفاظ پر بھی اثر کرے گی، اگر مضمون بالکل لغو ہو، اور الفاظ اچھے ہوں، تو الفاظ بھی بیکار ہوں گے جس طرح مردہ کا جسم کہ یوں دیکھنے میں سب کچھ سلامت ہے، لیکن حقیقت کچھ بھی نہیں، اسی طرح مضمون گواچھا ہو، لیکن الفاظ اگر بے

ہیں، تب بھی شعر بیکار ہوگا، کیونکہ روح بغیر جسم کے پائی نہیں جاسکتی۔

اس معیار پر سبھی دیکھا جائے، تو مرزا کے الفاظ اور ترکیبیں لاثانی ہیں، بلکہ جو شعریت اور جدت ان میں موجود ہے، متقدمین کسی اور کے ہاں اس کا ہلکا سا نقش بھی نہیں پایا جاتا، غالب کو خود بھی اس پر نماز تھا، اور بالکل بجا طور پر فرمایا ہے :-

گنجینہ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے جو لفظ کہ غالب مرآۃ اشعار میں ہے ہر ترکیب اور ہر لفظ میں ایک ایسی والہانہ موسیقی پائی جاتی ہے، کہ گویا ایک نغمہ زار ہے، جس سے ہر قسم کی آوازیں اٹھتی ہیں، کو لمبوس کی مثل ہر لفظ میں ایک نئی دنیا کا پتہ چلتا ہے، اور دل میں ایک نیا سوز و ساز پیدا ہوتا ہے، ایک جوہری بھی اپنے قیمتی جواہرات کو اس خوبی سے منسلک نہیں کرتا، جس خوبی سے کہ مرزا اپنے الفاظ کو ترتیب دیتے ہیں، ذیل میں ایک ایسا انتخاب درج کر دیا جاتا ہے، آپ خود اندازہ فرمائیں :-

دام شنیدن، تمار رسوم، آتش خاموش، جوہر اندیشہ، گلاب گسل
شبستان، وریائے مے، پہلوئے اندیشہ، غرق مسکدان،

۱۷ شعرالجم جلد چہارم ص ۶۹

۱۸ واضح ہو، کہ ریگستان اور گلستان وغیرہ کے قیاس پر شبستان بھی مرزا ہی کی طبع جدت طراز کا نتیجہ ہے، کسی اور سے جن نہیں پڑا، ۱۸ ص ۷۰

خانہ زاد زلف، زنجیرِ سوانی، جمع و خرچِ دریا، نقشِ دنگِ طاقِ نسیان،
 موجِ نگاہ، نبضِ خص، تشنہٴ فریاد، میکہدہ بے خروشن، خلوتِ ناموس
 صیدِ زدامِ جستہ، خودداریِ ساحل، شہپرِ رنگ، موجبِ گل،
 آئینہٴ بادِ بہاری، گذرِ گاہِ خیال، برگِ ادراک، طالعِ خاشاک،
 آئینہٴ انتظار، خصِ جوہر، لذتِ سنگ، گردشِ دنگ، افشودہٴ انگور،
 شہرِ آرد، صحراِ دستگاہ، دریا آشنا، محشرِ خیال، مژگانِ سوزن، مژگانِ نیم
 کنگرِ استغنا، سلکِ عاقبت، محاشِ جنوں، دامنِ تمنا، دریا بے بیانی،
 وادیِ خیال، سیاستِ دربان، نسیمِ نقدِ دو عالم، خانے پائے خزاں،
 طلسمِ پیچ و تاب، طعنہٴ نایافت، جنتِ نگاہ، فردوسِ گوش، کالبدِ دیوانہ،
 گلستانِ تسلی، چقمِ صحرا، قلمِ صرصر، جو بیا رنگہ، موجبِ رفتار، شیرازہٴ مژگان،
 برخوردِ رستہ، رنگِ فروغ، دامنِ خیال، قلمِ خون، غبارِ وحشت،
 شرارِ جستہ، حبیبِ خیال، دعوتِ مژگان، نو بہارِ ناز و غیرہ وغیرہ،
 ان مثالوں میں ہر جگہ صوری اور معنوی محاسن کو اس طو پر ملحوظ
 کر دیا گیا ہے، کہ کہیں ذرہ برابر بھی فرق یا اختلاف پیدا ہونے
 نہیں پایا!

بلاغت [بلاغت کیا ہے؟] تقلیل الفاظ بلا اختلال معنی، اس

لحاظ سے مرزا کا کلام سرتاپا بلاغت ہے، ایک وسیع سے وسیع
 مضمون کو گنتی کے چند الفاظ میں انتہائی خوش اسلوبی سے ادا کرتے
 ہیں، اور اس اختصار میں بعض بعض جگہ ایک نہایت لطیف حذف

بھی پیدا ہو جاتا ہے، جو خاص انہیں کا حصہ ہے، کوئی دوسرا ایسا کسے بھی، تو معافی میں یہ حسن پیدا نہیں کر سکتا، مثلاً :-

مجھ تک اب انجی بزم میں آتا تھا دو جامِ ساقی نے کچھ ملا دیا ہو شراب میں
دوسرے مصرع کے شروع میں یہ چند الفاظ محذوف ہیں (اور
آج جو خلاف معمول آیا ہے تو) اس طرح سے پورے کا پورا شعراک
دلاویز نثر کی صورت اختیار کر لیتا ہے، لیکن اس میں بھی وہ کیفیت نہیں،
جسے انسان کا وجدان شعر کے پڑھنے سے خود بخود پالیتا ہے، اسی طرح
ایک اور شعر ہے :-

بہرائوں میں تو چاہیئے دنا ہوا التفاتِ سننا نہیں ہوں یا مکرر کہے بغیر
دوست نے ایک بات کہی، اور مرزا نے دانستہ تجاہل عارف
اختیار کیا، اور اس کا سبب یہ تھا، کہ محبوب کی آواز میں جو حلاوت،
جو موسیقی، اور جو دلربا شہرت ہے، کان اس سے بار بار لذت یاب
ہوں :-

مرا ہوں اس فانیہ ہر چند سرا جئے جلاؤں لیکن وہ کہے عایش کماں او
اور اسی طرح :-

میں گیا بھی وال تو انجی گالیوں کا کیا جوا یا تھیں جتنی دُعائیں صرف بہاؤ گئیں
یعنی دُعائیں تو جقدر بھی مجھے یا تھیں، دربان ہی کے برا بھلا
کہنے پر اُس کی نذر کر چکا، اب جو لطافت اور غذائیت آگے چل کر
محبوب کی "گالیوں" سے میرے دل کو حاصل ہونے والی ہے، اس کا

حق کہاں سے ادا کرونگا؟ مومن کہتا ہے :-
 دشنام یا طبعِ حویں پر گراں نہیں اے ہنفسِ نزاکتِ آواز دیکھنا
 اب عشق کے ان تمام احساسات کو ملحوظ رکھتے ہوئے جب معشوق
 نے اپنے سوالات کا مرزا کی طرف سے کوئی جواب نہ پایا، تو سخت برہم ہوا
 اور بگڑ کر بولا، ”بہرے ہو؟“ بات کیوں نہیں سنتے؟“

اس پر بیچا لے مرزا نے بھی اک نیا زندانہ لہجہ میں کہا :-
 بہرہوں میں تو چاہیئے دونا ہوا التفات سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر
 اب خیال فرمائیے، کہ اس میں کتنی باتیں محذوف ہیں، اور اس حذف
 نے شعر میں کس قدر شوخی اور بلاغت کا اضافہ کیا،

اسی طرح ایک اور شعر ہے :-

کیا وہ بھی بے گنہ گنِ حق ناشناس ہیں مانا کہ تم بشر نہیں خوشید و ماہ ہوا
 جھگڑا یہ ہے، کہ مرزا اپنے معشوق کو بشر منوانا چاہتے ہیں، اور وہ
 اسے اپنی تہمین خیال کرتے ہوئے تسلیم نہیں کرتا، اور کہتا ہے کہ میں
 تو سورج اور چاند سے کسی طرح کم نہیں، پھر مجھے بشر کا خطاب کیلئے
 دیا جائے، مرزا ناچار اس دعویٰ پر آمنا و صدقنا کہتے ہیں، اور اپنے
 حقیقی مدعا کو پیش نظر رکھتے ہوئے فرماتے ہیں، کہ تم بلاشبہ سورج اور
 چاند ہی سہی، مجھے اس سے مطلق انکار نہیں، مگر یہ تو بتلاؤ، کہ کیا وہ
 بھی تمہاری طرح ظالم اور احسان فراموش ہیں؟ اور اگر وہ ایسے نہیں
 تو پھر میرے ساتھ یہ سلوک کیونکر جائز سمجھ لیا گیا ہے،

یہاں بھی آپ خیال فرما سکتے ہیں، کہ باہمی گفت و شنید کے کتنے اجزاء ہیں، جنہیں اس شعر میں حذف کر دیا گیا تھا، اور یہ حذف بھی رنگینی اور بلاغت میں کس قدر معین ثابت ہوا ہے، گویا :-
میں جو کہتا ہوں کہ ہم لینے کیلئے قیامت نہیں کس عورت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم جو نہیں پھر ایک اور شعر ہے :-

غالب تراحوال سناؤں گے ہم ان کو وہ سن کے بلا لیں اجارا نہیں کرتے
یہاں بھی مرزا اپنے ایک ہمدرد دوست کو بطور قاصد، معشوق کی طرف بھیج رہے ہیں، اور اس کے سامنے اپنی خراب کمالی اور محرومی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں، کہ معشوق کو متاثر کرنے میں اپنی طرف سے کسی طرح کی کمی باقی نہ رہنے دینا، اور التجا کرنا، کہ اگر اس تشویشناک حالت میں بھی تو نے اس کی خبر نہ لی، اور اسے ازراہ شفقت اپنے پاس بلا لیا، تو وہ تیرے فراق میں تڑپ تڑپ کر جان ڈے دیگا، اور وہ وقت دور نہیں، جبکہ تو اس کی موت کی خبر بھی اپنے کانوں سے سن لے، اس کے جواب میں وہ ہمدرد دوست مرزا کو پوری تسلی دلاتا ہے، اور کہتا ہے، کہ میں تو اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گا، لیکن بلانا یا نہ بلانا اس کے اختیار میں ہے، جس کی نسبت میں ذاتی طور پر ذمہ داری لینے کیلئے تیار نہیں !

یہ شعر بھی مرزا نے اس خوبی سے ترتیب دیا ہے، کہ اس میں اپنی التجا اور گریہ و زاری کو سراسر حذف کرتے ہوئے صرف دوست

کا جواب نقل کر دیا ہے، جس سے طبیعت اصل حالات کا خود بخود اندازہ کر لیتی ہے !

پھر اس ضمن میں غالب کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے، کہ وہ اپنے شعر میں قوتِ ایمانی سے بہت کام لیتے ہیں، اور غور کیا جائے، تو یہ چیز بھی بجائے خود بلاغت کا جزوِ اعظم ہے، اکثر جگہ ایک ایک لفظ اپنے اندر لطائفِ معنویہ کے سینکڑوں گنجینے لٹے ہوئے ہے، چنانچہ ذیل کی مثالوں سے آپ کو اس حقیقت کا اندازہ بہت اچھی طرح سے ہو جائیگا، فرماتے ہیں:-

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمد
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا اشیاں کیوں

اب دیکھئے، کہ اس کے الفاظ اپنے لئے کس قدر وضاحت اور تشریح کے خواہاں ہیں،

(۱) حالت یہ ہے، کہ ایک بلبل چمن اور اشیاں سے جدا ہو کر گرفتار ہو گئی ہے،

(۲) اُس نے اپنی آنکھوں سے بجلی گرتے ہوئے دیکھی ہے، اور قفس میں متردد ہے، کہ نہ معلوم میرا اشیاں نہ بچا یا جل گیا،

(۳) ایک اور بلبل جو اس کی ہم صنف اور ہمد ہے، سامنے کے درخت پر آکر بیٹھ گئی ہے، اور اس پر قفس بلبل نے اس سے

رودادِ چین کو دریافت کرنا چاہا ہے ،
(۴) مگر چونکہ اس کا آشیانہ جل گیا ہے ، بلبل ہمصفر مفصل حال
کہتے ہوئے پس و پیش کرتی ہے ، کہ اس آفتِ اسیری میں آشیانے
کے جلنے کی خبر کیا سناؤں ،

(۵) بلبل نو گرفتار کے دل میں اگرچہ اس کا کھٹکا ہے ، تاہم اسنے
اپنے دل کو مطمئن کر لیا ہے ، کہ باغ میں ہزاروں آشیانے ہیں کیا
میرے ہی آشیانے پر بجلی گری ہوگی ، اس لئے وہ اپنے ہمصفر سے
رودادِ چین پوچھتی ہے ، اور وہ اس کے بیان کرنے میں لیت و لعل کرتی ہے ،

ان تمام حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس شعر پر نظر ڈالی جائے ، تو معلوم
ہوگا کہ کس کس ترتیب کے ساتھ اسکا ایک ایک لفظ ایک سیع مضمون کو ادا کر رہا ہے
بلبل کی نو گرفتاری کی طرف محض ایک ”قفص“ کا لفظ اشارہ کر رہا
ہے ، اس مفہوم کو کہ ”اُسنے خود چین میں بجلی گرتے ہوئے دیکھی ہے
اور اپنے آشیانے کی نسبت متردو ہے“ صرف ”کل“ کے لفظ سے
ادا کیا ہے ، اس خیال کو کہ ”اس کا ہمصفر سامنے کی کسی شاخ پر آ بیٹھا
ہے“ اور وہ اس سے رودادِ چین دریافت کرنا چاہتی ہے ، لیکن وہ
اس کی ہمدردی کے خیال سے اس کے کہنے سے ڈرتا ہے ”اس مختصر
فقہ میں کہ“ مجھ سے رودادِ چین کہتے نہ ڈرہم“ ظاہر کیا ہے ، اب
اس تمام بحث سے شاعر کا اصل مقصود یہ ہے ، کہ میں ہمیشہ سے
مورودِ آفات چلا آتا ہوں ، اور زندگی کا کوئی پہلو بھی کبھی محفوظ رہنے

نہیں پایا، لیکن اس مضمون کو استعارے کا رنگ دیکر اشاروں ہی اشاروں میں اس بلاغت اور اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ہزاروں تفصیلیں اس پر سے قربان کی جاسکتی ہیں، مومن نے بھی اس مفہوم کو ادا تو کیا، لیکن غالب کا شعر اس سے کہیں بلند ہے، کیونکہ وہاں بربادی کے اسباب مکمل طور پر پائے جاتے ہیں، اور یہاں ناقص طور پر، مومن کا شعر یہ ہے، موازنہ آپ خود فرمائیں :-

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے صیاد کی نگاہ سُوئے اشیاں نہیں

اسی طرح مرزا کا ایک اور شعر ہے :-

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

اب یہاں بھی شعر کو پڑھتے ہی سوال پیدا ہوتا ہے، کہ بہشت میں دوست کا گھر یاد آجائے پر رضواں سے الجھ پڑنا کیا معنی رکھتا ہے؟ لیکن غور کیجئے تو مرزا کی لغزگوئی نے یہاں بھی بلاغت کو ایک نئی شان سے پیش کیا ہے، فقط ”لڑائی“ کا لفظ ہی اس میں ایک ایسا لفظ ہے، جو شعر کے تمام معنوی لطائف کی طرف خود بخود اشارہ کر رہا ہے، لڑائی کے حقیقت میں دو اسباب ہیں، ایک تو یہ کہ وہاں محبوب جیسی دلربائی اور کشش کسی اور میں نہیں پائی جاتی، چنانچہ بقول خود :-

تسکین کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ہے حورانِ خلد میں تری صورتِ مگر ہے

دوسرے یہ کہ وہاں ایسی رونق اور چہل پہل موجود نہیں، جیسی کہ ہم محبوب کے کوچے میں دیکھتے ہیں :-

کم نہیں ملوہ گری میں سوچے بہشت یہی نقشہ ہونے اس قدر آباد نہیں
تو اس کے بعد مرزا کا اصل مقصد اور مدعا یہ ہے کہ دل لگی اور
فرحت کی ان تمام ضروریات کے ناپائید ہوتے ہوئے بھی رضوان
(داروغہ جنت) کا ہم سے کہنا کہ ہمیں رہو، اور ایسی برگزیدہ جگہ کو
چھوڑ کے اور کہیں نہ جاؤ، کس حد تک صحیح اور معقول تسلیم کیا جاسکتا
ہے؟ اور اگر وہ اس پر ہم سے اصرار کرے، تو ہم اُس کے ساتھ
متفق کیونکر ہو جائیں؟ گویا:-

بیٹھا ہو جو کہ سایہ دیواریاں میں فرمانروائے کشورِ ہندوستان ہے
مجنوں سے کسی نے دریافت کیا تھا، کہ لیلے سے تو بیشک تجھے
محبت ہے، لیکن یہ کیا بات ہے کہ تو اس کی بستی میں سے گزرتے ہوئے
دیواروں کو بھی بوسہ دیتا ہے؟ اس نے جواب میں کہا، کہ ان اینٹوں
میں بھی مجھے لیلے ہی کی جھلک دکھائی دیتی ہے، اس لئے میں انہیں
بوسہ دینے پر مجبور ہوں!

اسی طرح مرزا کا ایک اور شعر ہے:-
غنیچہ ناشگفتہ کو دوسری مت دکھا لیں بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منہ سے بیا کہ یو
یہاں بھی مرزا نے معشوق سے بوسہ طلب کیا، لیکن وہ بجائے
بوسہ دینے کے "غنیچہ ناشگفتہ" ہی کو دکھلا کے اپنا پیچھا چھڑانا چاہتا
ہے، یعنی ہمارا تو دہن ہی "معدوم" ہے آپ بوسہ کس چیز کا لینے؟
مرزا بھی ایک زندہ ہیں، اس جواب کو نا کافی سمجھتے ہوئے کہتے ہیں،

کہ میں تمہارے ذہن کے معرودم ہونے کا ثبوت یوں نہیں چاہتا، بلکہ میرے نزدیک اگر ہونٹوں سے ہونٹ ملاؤ، تو پتہ چلے کہ تمہارا منہ فی الواقع ابھی وجود میں نہیں آیا ہے، تو اس شعر میں بھی فقط غنیہ ناشکفہ ہی کی ترکیب ہے، جو اس کی تمام رنگینی اور معنویت پر از خود اشارہ کر رہی ہے،

اس کے علاوہ عام طور پر بھی دیکھا جائے، تو مرزا کا کلام بلاغت کی حدِ کمال تک پہنچا ہوا ہے، ایک ایسے مضمون کو جو دفتر کے دفتر سیاہ کر دینے پر بھی ناقص اور تشنہ رہ جاتا، مرزا ایک ہی شعر میں ادا کر جاتے ہیں، اور اس خوبی سے کہ اس سے بہتر پیرایہ تصویریں نہیں آسکتا مثلاً اسی شعر کو لیجئے :-

گر تھے دل میں ہوجیاں صل میں شوق کا زوال

موج محیط آب میں مار ہو دستِ پاکہ یوں

یہاں فلسفہ عمل کے ایک نہایت ہی دقیق مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے، فرماتے ہیں، کہ زندگی کا سوز و ساز اور جذبہ ارتقاء کا نشو و نما ایک پیچ اور مسلسل جدوجہد سے ہے، باطنی تحریک اور ذوقِ جستجو کے استقلال سے ہے، حیاتِ جاودال کا راز اگر کوئی معلوم کرنا چاہے، تو وہ ایک غیر منقطع تکمیل میں ہے، وصال سے فطرتِ انسانی کی تمام قوتیں مضمحل ہو کر رہ جاتی ہیں، اس سفر میں منزل کا نام بھی نہیں لینا چاہیے کیا تم دیکھتے نہیں، کہ ایک موج اسی وقت تک بے تاب بیقرار رہتی ہے

جب تک کہ وہ ذوقِ سفر اور شوقِ نمود سے آشنا ہے، لیکن جوہری اس نے ساحل کی طرف رُخ کیا، وہیں اسکی تمام امکانی قوتیں زائل ہو جاتی ہیں اور وہ موت کے آغوش میں ہمیشہ کے لئے سو جاتی ہے، اقبال نے بھی ٹھیک کہا ہے :-

توہ شناسی ہنوز شوقِ بمر وصال چستِ حیاتِ دوام؟ سوختنِ ناتمام
اور اسی طرح ایک دوسری جگہ بھی :-

رازِ حیات پوچھ لے خضرِ خجستہ گام سے زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ ناتمام
اب مضمون کی اہمیت اور نزاکت کو بھی آپ ملاحظہ فرمائیں، اور پھر مرزا کے شعر کو بھی دیکھیں کہ کس حسنِ انداز اور عمدہ تمثیل سے اس کا حق ادا ہوا ہے !

پھر اسی مثال کو اس کے دوسرے پہلو یعنی حسنِ عشق کے باہمی تعلقات اور نفسیاتی خواص کے ماتحت دیکھا جائے، تو پھر بھی یہ ایک لاشانیِ تنجیل ہے :-

گرتے دل میں ہو خیالِ وصل میں شوقِ کارِ دال
موجِ محیطِ آب میں مائے دستِ دُپا کہ یوں

یعنی موج کا مضطرب یا بالفاظِ دیگر زندہ رہنا، ساحل سے دور رہنے ہی پر تو موقوف ہے، اسی طرح ایک عاشق کے لئے بھی زندگی کا سامان فقط بجز و فراق کے اندر ہے، اور یہ ایک ایسی ضرورت ہے، جس کے بغیر فکر و نظر کی تمام شعریّت برباد ہو جاتی ہے، یہی وجہ ہے،

کہ ایک دوسرے مقام پر بھی کہا :-
 خوش ہوتے ہیں وصل میں لوں مرنے والے
 آئی شبِ ہجر اں کی تنہا مے آگے
 مومن کا خیال یہاں بھی ٹھیک ہے :-
 بخود تھی غش تھے محو دنیا کا غم نہ تھا جینا وصال میں بھی تو مرنے سے کم نہ تھا
 آپ کو یاد رہنا چاہیے کہ غالب نے مومن کے ایک خاص شعر کے
 عوض جو اپنا سارا دیوان دے دینے کی آرزو کی تھی، تو اس کی وجہ بھی
 احساسات کا یہی پاکیزہ اور لطیف ہیجان تھا، وہ شعر یہ ہے :-
 تم مے پاس مجھے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
 یہ شعر تصور پر کہا گیا ہے، اور جیسا کہ ظاہر ہے، تصور کا وجود بغیر
 ہجر و فراق کے ممکن ہی نہیں ہو سکتا، گوئے جس کے خیالات غالب
 سے اس قدر متفق دکھائی دیتے ہیں، اس مقام پر بھی مرزا کی تائید کرتے
 ہوئے لکھتا ہے :-

اے جوان! آرزو کا رنگ اپنے ہاتھ میں لے، معشوق کی تصویر شب
 کی تنہائی میں کھینچ، اور اس طرح تمام دن اس کی شعاعِ نظر کے ذریعہ
 اطمینان اور خوشی کا میٹھا میٹھا رس پتیا رہ؛ — اگرچہ محبت کے صحیح
 قوانین کوئی عاشق بھی نہیں جانتا ہے، لیکن محبوب کا دیدار حاصل نہ ہو سکنے
 کی صورت میں دل کی مسرت ہر لحظہ ترقی کرتی رہتی ہے، اور یہ پھول کبھی
 مرجھانے نہیں پاتا !

اے دوست! وقت اور جدائی کی غیر فانی طاقتیں ہمارے خون

کو بہت جلد معجزہ نہیں ہونے دیتیں، اور ان کی روشنی اپنے اندر ستاروں کی
سی بلندی اور حکمگاہٹ رکھتی ہے : اگرچہ میرے حواس ایسی حالت میں
غم ضرور محسوس کرتے ہیں، لیکن پھر بھی میرا سینہ روز بروز فراخ ہوتا چلا جاتا
ہے، اور میں اسے پہلے کی نسبت زیادہ مضبوط اور زیادہ مطمئن پاتا ہوں،
— اے دوست خدا کی رحمتیں ہوں ایسے مبارک سینے پر !

فراق کی حالت میں میں اپنے معشوق کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا، (اور اگر
تو غور کرے) تو یہی راز ہے، میرے قومن و قہر، اور اندوہ سے آزاد رہنے
کا، اور یہی ہے وہ جنت جس کا مقابلہ کوئی اور چیز نہیں کر سکتی !
میں دیکھے، معشوق کا آرزو مند رہنا، بظاہر کتنا ہی مضحکہ خیز کیوں نہ ہو،
لیکن (تجسس کیا معلوم کہ) یہی چیز نتیجہ کار ایک معصوم اور سچی ذاتیت میں
منتقل ہو جاتی ہے، اور یہی ہے وہ مقام جہاں شوق اپنی انتہائی
عزت کو حاصل کر لیتا ہے !

اے دوست ! بادل بھی اس سبک میری اور برقِ رفاہی سے
آسمانی بلندیوں میں نہیں تیر سکتا، جس سہولت اور جس بے تکلفی سے کہ میرا
دل ہجر و فراق کی حالت میں اُٹتا، اور پرواز کرتا ہے، — اور اس طرح
حسد یا رقابت کے جھگڑوں سے آزاد رہ کر میں اکیلا ہی اُس سے محبت
کرتا ہوں، اور اس میں کوئی بھی میرا شریک نہیں !

اس نظم کا عنوان ہی گوئیٹے نے ”بحر کی مسرت“ قرار دیا ہے، ”۱۱“

اس کے علاوہ شکمہ گوٹے کا ایک دوست اور محضر شاعر بھی
اسی کی تصدیق کرتا ہے، اور کہتا ہے :-

”اگر تو نے حسن کو جہاں کے مضطرب لمحات میں کبھی نہیں دیکھا ہے، تو تو
یہ دعویٰ ہرگز نہیں کر سکتا کہ تو نے حسن کی صحیح شعوریت کو کبھی سمجھا
بھی ہے۔“

فلسفہ ہجر کی اس بحث کو سمجھ لینے کے بعد بعض دیگر مثالیں پر بھی نظر
دوڑائیے، چنانچہ :-

نفسِ آنجن آرزو سے باہر کھینچ اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ
فرماتے ہیں، کہ اگر مقصد باری کے لئے سامان ابھی تیار نہیں ہوا ہے،
تو کم از کم امید کا رشتہ تو ہاتھ سے نہ دے، آرزو ایک ایسی چیز ہے، جس کا
ہونا عمل کے لئے نہایت ضروری ہے، بلکہ جو شخص آرزو کا جذبہ اور تمنا
کی آگ اپنے سینے میں مشتعل نہیں رکھتا، اُسے سمجھ لینا چاہیے، کہ
خدا کے سامنے بھی میں رُوسیا ہوں، اور دنیا میں بھی میرا کچھ حصہ نہیں،
آرزو حقیقت میں ایمان کی بنیاد ہے !

سلم استی سینہ را از آرزو آباد دار ! (اقبال)
ہر زماں پیشِ نظر لایِ خِلْفِ المیعاد دار

پھر فرماتے ہیں کہ :-

اہلِ بنیش کو ہی طوفانِ حوادثِ مکتبِ لطیفِ موجِ کم از سیلِ اُستاد نہیں
مضمون کی وسعت کو دیکھئے، اور پھر الفاظ کی بلاغت پر بھی نظر

ہو، کہا یہ گیا ہے کہ سلیم الفطرت انسان کے لئے مصائب اور تکلیفیں بھی اپنے ساتھ عبرت اور نصیحت کے بہت سے مفید سبق لاتا ہیں، لیکن کم حوصلہ اور تنگ ظرف لوگ ایسے زہین مواقع کو بھی محض شکوہ و شکایت میں ضائع کر دیتے ہیں، مرزا نے ایک اور جگہ بھی اس خیال کو ظاہر کیا ہے :-

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے دواں اور

حسن استدلال شعر کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے، کہ جہاں شاعر کسی چیز کا دعویٰ کرے، وہاں اس کی تصدیق کے لئے دلیل بھی ایسی ہی قوی اور معقول ہونی چاہیئے، اکثر شعراء کے ہاں دیکھا گیا ہے، کہ وہ کسی شے کے متعلق دعویٰ تو انتہائی شد و مد کے ساتھ کرتے ہیں، لیکن ان کی دلیل اس قدر پھسپھسی اور بے جان سی ہوتی ہے، کہ اس کا طبیعت پر ذرا بھی اثر نہیں ہوتا، ہم یہاں دکھلانا چاہتے ہیں، کہ غالب اپنے اندازِ بلاغت کے ساتھ ہی ساتھ حسن استدلال میں بھی کتنا لطیف اور مؤثر سلیقہ رکھتے ہیں، شعریت اور تخیل کی انتہائی خوبیوں کو برقرار رکھنے کے باوجود دعویٰ اور دلیل میں بھی ان کے دونوں پلٹے یکساں طور پر بھاری دہتے ہیں، چنانچہ ذیل کی چند مثالوں سے اس حقیقت کا اندازہ کیجئے، فرماتے ہیں :-

مے بنیائے میں تو کعبہ میں گارڈین کو
معاذی بشرطِ اتواری اہل ایاں ہے

یہاں دوسرا مصرع دعویٰ کے طور پر لائے ہیں، اور پہلے مصرع میں اس دعویٰ کی دلیل پیش کی ہے، اگر کسی شخص کے سامنے محض دوسرا مصرع ہی پڑھ دیا جائے، اور پہلے کی نسبت اُسے علم نہ ہو، تو وہ اس کو سنکر بے اختیار منہس دیگا، اور اسے کہنے والے کی بدحواسی پر محمول کریگا لیکن اس کے سامنے جب پورا شعر پڑھ کر سنایا جائے، تو وہ سنتے ہی اس کی صداقت اور واقعیت پر سو جان سے قربان ہونے لگیگا، اعلانیات میں وفاداری کا بھی ایک خاص درجہ ہے، اور جس شخص میں یہ صفت پائی جائے، وہ ہر لحاظ سے قابل احترام بھی ہے، لیکن مرزا کہتے ہیں، کہ محض وفاداری بھی کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی، بلکہ ضرورت اس امر کی ہے، کہ اس وفاداری میں استواری کا رنگ بھی موجود ہو، ایسی وفاداری جو ثبات و استقلال سے عاری ہو، کسی حالت میں بھی مفید نہیں ہو سکتی، یہی وجہ ہے، کہ شیخ مسلمان ہوتے ہوئے بھی اگر کعبہ سے بے وفائی کرے، تو ہم اسے کافر سے بھی بدتر سمجھیں گے، کیونکہ اس کا ایمان اس بارے میں اتنا ہی بودا اور کمزور ثابت ہوا۔

گلا جھٹائے وفانا جو حرم کو اہل حرم سے ہے

کسی تباہی میں یاں کروں تو کو صنم بھی ہر جی

اسی طرح ایک برہمن گو کہ وہ ہمارے نزدیک مشرک اور بے دین ہے، لیکن وفاداری اور یقین جیسی صفات عالیہ کو برقرار رکھنے کی وجہ سے پکا مومن ہوا، اور جب ایسا ہے تو بے شک اسے کعبہ میں دفن

ہونے کے لئے جگہ ملنی چاہیئے !!
اقبالؔ امرِ خودیؔ میں بھی اس پاکیزہ اور مقدس خیال کو ایک لمبے
 کی صورت میں بیان کیا ہے، چنانچہ شیخ کی زبانی برہنہ کو یہ ملحقین کی گئی
 ہے کہ :-

من گوئم از بتاں بیزار شو	کافرِ شائستہ ز تار شو
اے امانت دار تہذیب کہن	پشتِ پا بر مسلکِ آبا مزن
گر ز جمعیتِ حیات ملت است	کفر ہم سرمایہ جمعیت است
تو کہ ہم در کافرِ کامل نہ	در خورِ طوفِ حریمِ دل نہ
ماندہ ایم از جادۂ تسلیم دور	تو ز آفرین زابرِ ایم دور
قیس با سب دانی محمل نشد	در جنونِ عاشقی کامل نشد

مرد چوں شمعِ خودی اندر وجود

از خیالِ آسماں پیمیا چہ سود !

یہ تو سب کچھ مرزا ہی کے استدلال کی مزید تشریح کیلئے آپ کے
 سامنے پیش کیا گیا، اب دوسرا شعر بھی ملاحظہ ہو،

کہتے ہیں :-

رہا آبادِ عالمِ اہل ہمت کے نہ ہو نیسے بھرے میں جس قدر جامِ سُبُوغِ مِیْ خالی
 یہاں بھی پہلا مصرع دعویٰ کے طور پر لائے ہیں، اور دوسرے
 مصرع میں اس دعویٰ کی دلیل پیش کی ہے، لیکن یاد رہے، کہ حبطِ رَح
 مرزا نے اس شعر میں :-

کی میرے قتل کے بعد اُس نے جناح کو توبہ ہائے اُس زود پشیمیاں کلبشیمان ہونا
 — زود پشیمیاں "کو دیر پشیمیاں" کے مفہوم میں استعمال کیا ہے، اسی طرح
 مندرجہ بالا شعر میں بھی "اہل ہمت" کو طنزاً "پست ہمت" اور نا کا رہ
 لوگوں کے لئے استعمال میں لائے ہیں، بیان کرنا یہ مقصود ہے کہ دنیا
 کا اس طرح سے آباد اور معمور دکھائی دینا پست ہمت لوگوں کے نہ ہونے
 کی وجہ سے ہے، کیونکہ اگر وہ ہوتے، تو ان کی سستی اور لا پرواہی سے
 دنیا لازمی طور پر ویران ہو جاتی، یہاں کی رونق اور گرم بازار سی تو حقیقت
 میں زندہ دل اور غنئی لوگوں سے ہے، پھر اس کا ثبوت یوں پیش کیا کہ
 میخانہ میں بھی پیانہ و سبزو شراب سے لبریز دکھائی دیتے ہیں، جو ایک طور
 پر اس کی معموری اور سلامتی کی دلیل ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں
 زندان بادہ آشام یعنی باہمت اور صاحبِ ظرف لوگ موجود نہیں؛ اسبطر
 سمجھ لو کہ دنیا بھی پست ہمت لوگوں کے معدوم ہونے سے (جو زندہ ہوں یا
 مردہ ہر حالت میں معدوم ہی ہیں) آباد دکھائی دیتی ہے، کیونکہ نہ ان میں
 اتنا حوصلہ ہے، اور نہ وہ اس کا رزارستی میں جو ان مردی کیساتھ ٹھہر سکتے
 ہیں، اس بیان کا اخلاقی فائدہ یہ ہوا کہ عمل انسان کے لئے
 لازمہ حیات ہے!

در عمل پوشیدہ مضمون حیات لذت تسخیر قانون حیات

(اقبال)

پھر فرماتے ہیں :-
 کسی کو دیکھ دل کوئی ناسخِ نفا کیوں
 یہ جو جبل ہی سینہ میں تو پھر نہ میں ان کو

دل کے کھوٹے جانے پر کسی عاشق زار کا نالہ و فریاد کرنا، بالکل قدتی چیز ہے، لیکن مرزا کے نزدیک اُس کا یہ فعل صرف تعجب خیز ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ جب دل ہی پر انسانی زندگی کا دار و مدار ٹھہرا، اور وہی سینہ سے غائب ہو گیا، تو پھر زبان بھی جو دوسرے اعضاء کی طرح دل کی محکوم تھی، حرکت سے کیوں باز نہ آجائے؟ جب محرک ہی باقی نہ رہا، تو تحریک و جستجو کا کیا مطلب؟ گویا:-

خوشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں رز وین میں
چراغ گشتہ ہوں میں بے زباں گوئیوں کا

اسی طرح ایک اور شعر ہے :-

تری ناز کی سوجانا کہ بندھا تھا ہودا کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا
معتشوق سے کہتے ہیں، کہ ہم نے تو شروع ہی سے یہ جان رکھا تھا،
کہ جو وعدہ تو کر رہا ہے، وہ نہایت سست بنیاد اور غیر معتبر ثابت
ہوگا، اور ہمارا اپنے اس خیال پر دلیل پکڑنا تیری نازک اندامی کی وجہ
سے تھا، کہ تجھ جیسا لطیف و نطیف ایک مضبوط اور پختہ چیز کو کب
توڑ سکتا ہے، یہ رشتہ ابتداء ہی سے بودا اور کمزور تھا، جمبھی تو تو اسے
توڑ بھی سکا ہے! گویا :-

تسے وعدے پر جٹے ہم تو یہ جان تھوٹ جانا کہ خوشی سے مرزہ جاتے اگر اعتبار ہوتا
پھر فرماتے ہیں، کہ :-

نظر لگے کہیں اُسکے دست و بازو کو یہ لوگ کیوں مئے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

یہاں پھر معافی میں ایک نئی بلندی اور نئی شان پیدا کر کے محبوب کی
 جفاکاری اور ظلم و ستم کا ثبوت پیش کیا ہے، فعل اپنے فاعل کی
 دستِ قابلیت پر دلیل ٹوکتا ہے، اسی طرح یہاں زخمِ جگر کی گہرائی بھی
 یہ ظاہر کر رہی ہے، کہ معشوقِ تنومند اور شہِ زور ہونے کے علاوہ
 پرلے درجے کا بے رحم بھی ہے، لیکن بایں ہمہ شاعر کو اس کی خیر خواہی
 منظر رہے، اور دوستوں کو منع کرتا ہے، کہ وہ ان زخموں کو نہ دیکھیں
 کیونکہ ایسا کرنے سے معشوق کے دست و بازو کو نظر لگ جانے کا
 اندیشہ ہے،

اس کے علاوہ :-

عرضِ ناز شوقِ نڈال بڑے خندہ ہے دعویٰ جمعیتِ احباب جا خندہ ہے
 دعویٰ تو یہ ہے، کہ دوستوں کا آپس میں مل بیٹھنا، اور محبت و فاداری
 کے پیمان باندھنا بالکل بے بنیاد، اور سراسر مضحکہ خیز ہے، لیکن مزاح ہے
 کہ اس کی دلیل کے لئے مثال بھی ایسی لائے ہیں، جس میں جمعیت اور
 محفل آرائی کے ساتھ ہی ساتھ اسکے بطلان کے لئے ثبوت بھی خود بخود
 پایا جائے، یعنی و انت بادِ جود آپس میں متحد اور مربوط ہونے کے اس
 حالت پر ازراہ تشبیح ہنس رہے ہیں، اور کہتے ہیں، کہ یہ منظر زیادہ
 دیر تک قائم نہیں رہ سکیگا!

پھر فرماتے ہیں کہ :-

گھر سارا جو نہ روتے بھی تو ویران ہوتا بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیا باں ہوتا

اس شعر میں بھی دعویٰ یہ ہے، کہ ہمارا گھر ہر زمانہ اور ہر حالت میں
دیران ہی دیران دکھائی دیتا، اگر سیل گر یہ اسے تباہ نہ کرتا، تو ہم دیکھتے
کہ گھاس پھوس کی فراوانی ہی سے اس نے ایک جشتناک جنگل کی صورت
اختیار کر لی ہے :

اگاہے گھر میں ہر سو سبزہ دیرانی تماشا کر مدار اب کھودنے پر گھاس ہو میر دریا کا
— پھر اس کے لئے دلیل یہ پیش کی، کہ جس جگہ اب سمندر ہے، یہ اگر
دہاں نہ بھی ہوتا، تو اس کی جگہ صحرا اور بیابان کا ہونا یقینی تھا، پس
جب مقصود ہر حالت میں بربادی ہی ہے، تو وہ جنگل سے ہوئی تو کیا،
اور دریا سے ہوئی تو کیا ؟

پھر فرماتے ہیں کہ :-
قری کف خاکستر و بلبل قفس رنگ اے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے
اس شعر میں یہ فلسفہ بیان کیا گیا ہے، کہ دنیا کی ہر چیز اپنی اپنی ضرورت
اپنے اپنے عشق، اور اپنے اپنے ذوق و شوق کی کوئی نہ کوئی دلیل اپنے
ساتھ لئے ہوئے ہے، چنانچہ قمری کو دیکھو، کہ وہ سرو کی جدائی میں جل جل
کر راکھ ہو گئی ہے، اسی طرح بلبل بھی اپنی دم کے نیچے پھول کی مانند سرخ
رنگ کا ایک داغ لئے ہوئے ہے، جو اُس کے عشق پر دلالت کرتا ہے،
اسی طرح شاعر کے جگر سوختہ کی دلیل بھی سوائے نالہ کے اور کوئی چیز
ہو سکتی ہے، اقبال نے بھی عشق کے اس معنوی تسلسل اور اشیا کے
باہمی ربط و ضبط کو اپنے الفاظ میں یوں ادا کیا ہے :-

حسنِ ازل کی پیدائش میں جھلکتے
انساں میں وہ سخن ہو غنچے میں وہ چمکتے
یہ چاندِ آسمان کا شاعر کا دل ہو گیا
واں چاندنی ہے جو کچھ یاں رُو کی کسکتے
اندازِ گفتگو نے ہو کے دیئے میں ورنہ
نغمہ ہو بجے بلبل بو پھول کی چمکتے
کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا رُخنی
جلگنو میں جو چمکتے وہ پھول میں مہکتے
یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو

ہر شے میں جبکہ پنہاں خاموشی ازل ہو
اکبر الہ آبادی کے یہ چند اشعار بھی اسی مفہوم کی ترجمانی کرتے ہوئے
پائے گئے :-

شاہدِ بزمِ ازل نے اک نگاہِ ناز سے
عشق کو اس انجن میں مستند آ کر دیا
شورِ شیریں کا مزار کھا سر فرما دیں
قیس کو دیوانہ اندازِ لب لے کر دیا
گردنِ پروان میں ڈالی کندِ شوقِ شمع
زنگِ گل کو دیدہ بلبل کا پھندا کر دیا
ذوقِ نظارہ سی جانوں کو ملایا خاکِ
گردشِ حشمِ تباں سے حشرِ برپا کر دیا

گویا دُنیا میں یہ سارا فیض اور تمام چہل پہل جو ہم دیکھتے ہیں، یہ
سب عشق ہی کی برکت سے ہے، بالفرص اگر یہی ایک چیز وجود میں نہ
آتی، تو دُنیا کی پیدائش ہی باطل تھی، اور ایسی حالت میں وہ ایک ایسا
جسم سمجھا جاتا، جو رُوح سے یکسر محروم ہو، غالب خود اس فلسفے کو
ایک اور شعر میں بوجہِ احسن بیان کر چکا ہے، اور وہ اس طرح کہ :-

رُفیقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے

انجن بے شمع ہے گر برقِ خرمن میں نہیں

اور اقبال تو اس کے سوز و اثر کو اس قدر وسیع سمجھتا ہے کہ :-
 بہ برگ لاله رنگ آمیز می عشق . بجان مابلایگز می عشق
 اگر ایں خاکداں را و اشگانی درونش بنگری خونریز می عشق
 پس غالب کے ہاں بھی عشق کے یہی تاثرات ہیں، جنہیں ہم
 قمری بلبل اور شاعر کے جگر سوختہ کی دلیل بیان کر چکے ہیں، قدرت
 نے یہ بیش بہا نعمت ہر ذی حیات کو بقدر ظرف "عنائت" کی ہے اور
 ہر جگہ اس کی تقسیم ایک مناسب نظام کے ماتحت عمل میں آئی ہے،
 میں اس مفہوم کو بھی اُن تشریحات سے منطبق کئے دیتا ہوں، جنکو
 "جاوید نامہ" میں غالب ہی کی زبانی بطور تفسیر نقل کیا گیا ہے،
 فرماتے ہیں :-

نالہ کو خیزد از سوزِ جگر	ہر گجا تا تیر او دیدم دگر !
قمری از تاثیر او سوختہ	بلبل از وے رنگہا اندوختہ !
اندرومرگے باغوشِ حیات	یک نفس اینجا جاتا ہر جا !
آپنجاں رنگے کہ از رنگی از دست	آپنجاں رنگے کہ بیرنگی از دست
توندانی این مقام رنگ بوست	قیمت ہر دل بقدر ہوا بوست !

یا برنگ آیا بہ بیرنگی گذر
 تا نشانے گیری از سوزِ جگر !

اس کے بعد ہمارے لئے ایک چیز خاص طور پر تحقیق کے قابل پہچانی
 ہے، اور وہ اس شعر کے لفظی مناسبات کا تسلی بخش حل ہے، لہذا

اسے ایک دفعہ پھر نظر غور ملاحظہ فرمائیے :-
 قمری کف خاکستر و بلبل قفسِ بگ اے نالہ نشانِ جگر سوختہ کیا ہے؟
 مدت سے یہ شعر ادباء کے لئے ایک دلچسپ مبحث چلا آتا ہے،
 اور ہر شخص نے بجائے خود دوسرے شاعرین سے اختلاف بھی کیا،
 رسائل میں پے درپے مضامین بھی شائع ہوئے، لیکن باوجود ان تمام
 باتوں کے یہ کوئی نہ سمجھ سکا، کہ قمری کو تو راکھ کے ساتھ مشابہت ہے
 بھی، مگر بلبل کو قفس سے کیا مناسبت ہو سکتی ہے، راقم المحروف
 عرض کرتا ہے، کہ یہاں قفس سے پنجرہ مراد نہیں ہے، بلکہ پھولوں کی
 وہ ٹوکری ہے، جو بلبل کو قید کرنے کے لئے کبھی کبھی استعمال میں لائی
 جاسکتی ہے، جیسا کہ شاعر نے خود بھی کہا :-

سبد گل کے تلے بند کئے ہو گلچیں مژدہ اے مرغِ کیباغ میں دینہیں
 اس کے علاوہ میرزا صاحب کے ایک شعر سے بھی اسی مفہوم
 کی تصدیق ہوتی ہے، چنانچہ :-

شکستہ بال و پر انیم جائے الِ دارد کہ باغیاں کنداز چوب گل قفس مارا
 پھر دوسرے مصرع میں "اے" بمعنی "جز" سمجھنا چاہیئے، یہ
 استفہام افزائشِ بلاغت کے لئے لایا گیا ہے، لطف یہ کہ شاعر
 جس چیز سے اپنے جگر سوختہ کا نشان دریافت کرنا چاہتا ہے، وہی
 حقیقت میں اس کی علامت بھی ہے، جس شعر میں تعجب نہ پایا جائے
 وہ شعر ہی نہیں، اور جیسا کہ ظاہر ہے، مرزا نے یہ انداز محض تعجب پیدا

کرنے کے لئے اختیار کیا ہے، شعر میں تجاہل عارف بھی معافی کے اسی
حُسن کو برقرار رکھنے کے لئے استعمال میں لایا جاتا ہے، چنانچہ اسی انداز
کو لئے ہوئے مرزا کا ایک اور شعر ہے :-

کس کسراغِ جلوہ ہے حیرت کہ اغدا آئینہ فرشِ شمشِ جہت انتظار ہے
کائناتِ عالم کی ہر چھوٹی بڑی چیز قطع نظر اس سے کہ وہ جاندار ہے
یا بے جان، خدا کے دیدار کی تلاش ہی ہے، لیکن مرزا جانتے بوجھتے ہوئے
بھی خدا ہی سے اس حقیقت کو دریافت بھی فرمانا چاہتے ہیں،

تو معلوم ہوا، کہ اس طرزِ بیان سے شاعر کا مقصد سامع کے دل
میں ہیجان پیدا کرنا، اور ایک بات کو زیادہ سے زیادہ رقیق، زیادہ سے زیادہ
لطیف، اور زیادہ سے زیادہ مؤثر شکل میں پیش کرنا ہوتا ہے !

معنی آفرینی معنی آفرینی معنی آفرینی بھی کلامِ غالب کا ایک خاص جوہر ہے، ہم
جب بھی اشعار پر غور سے نظر کرتے ہیں، ہر دفعہ معافی کا ایک نیا جلوہ
سامنے آتا ہے، ہر بات سے ایک نہ ایک لطیف نکتہ ضرور پیدا ہوتا ہے
یہ بھی گویا ایک معدن ہے، کہ جس قدر کھودتے جاؤ، جواہرات بھی نیچے سے
برآمد ہوتے چلے جاتے ہیں، چند مثالیں یہاں نقل کی جاتی ہیں،
ملاحظہ ہو :-

ہر ماں موکے بلا لو مجھے چاہو جس وقت میں گیا وقت نہیں بول کہ پھر کبھی سکوں
اس شعر سے جہاں یہ معنی پیدا ہوتے ہیں، کہ محبوب جب بھی چاہے،
بڑی خوشی سے ہمیں بلا سکتا ہے، اور ہم تعمیلِ ارشاد میں فی الفور حاضر

ہو جائینگے، وہاں ایک اور معنی بھی، جنہیں اصل میں ایک اعلیٰ درجے کی اخلاقی تعلیم سمجھنا چاہیئے، یہ پیدا ہوئے کہ گیا ہوا وقت دوبارہ ہاتھ نہیں آیا کرتا، لہذا اسے یہودہ باتوں میں ضائع نہیں کر دینا چاہیئے : ایک خود مرزا کا آنا ہے، اور دوسرے وقت کا لوٹ کر آنا، لیکن خوبی یہ ہے، کہ دونوں کو ایک ہی لفظ میں ادا کر دیا گیا ہے،

اسی انداز پر دوسرا شعر ہے :-

ضعف میں طوعِ اغیار کا شکوہ کیا ہے، بات کچھ سرت نہیں ہے کہ اٹھا بھی سکوں
شاعر بسترِ عدالت پر ہے، ضعف سے حرکت کرنے کی بھی تاب نہیں
اور اغیار ہیں، کہ وہ سجائے عیادت کے اٹنا زخم پر نش زنی کرتے ہیں، اور
کہتے ہیں، کہ ایک تو بے نصیب، ہجر کا مارا یہاں تڑپ رہا ہے، اور ایک
ہم ہیں، کہ دوست کے ساتھ مزے سے بسر اوقات کرتے ہیں، یا زیادہ
سے زیادہ لطف و کرم فرمایا، تو یوں گویا ہوئے :-

غیر یوں کرتا ہی میری پرستش اسکے جس
تاکہ میں جانوں کہ ہر شے سبائی وائے ملک
جبکہ میں کتابوں اپنا شکوہ ضعفِ دماغ
چپکے چپکے مجھ کو لے دیکھ پاتا ہے اگر
ہر بانی ہائے دشمن کی شکایت کیجئے
یا بیاں کیجے سپاس لنتِ آزارِ دوست
یہاں تلک تو ایک بات ہوئی، لیکن دوسری حیثیت سے شاعر کو
اپنے ضعف اور کمزوری کی شدت کا اظہار منظور ہے، اور کہتا ہے کہ میں ان

تمام باتوں کو بڑی خوشی سے برداشت کر لوں گا، اور کیسے نہ کروں جبکہ میں ضعف کی وجہ سے اس قابل بھی نہیں ہوں، کہ تیکے سے اپنا سر ہی اٹھا سکوں!

یہاں بھی ایک سر کا اٹھانا ہے، اور ایک بات کا اٹھانا، یعنی اسے برداشت کرنا،

اسی طرح تیسرا شعر بھی ہے :-
 نہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستمگرہ ورنہ کیا قسم ہے ترے ملنے کی کھانہ سکو
 یعنی میں تیرے جو رستم سے اس درجہ تنگ آچکا ہوں، کہ مجھے اب نہر کی تلاش ہے، کہ اُسے کھاؤں، اور ہمیشہ کے لئے سو رہوں، لیکن افسوس کہ وہ مجھے کہیں بھی میسر نہیں آتا، ... پھر اسی ضمن میں ایک ایسی تضاد بات پیدا کی، جو فی الحقیقت ہر عاشق کا ایک فطری خاصہ ہوا کرتا ہے، یعنی انتہائی خوبی سے اپنی محبت اور شوق کا اظہار بھی کیا ہے، اور کہتا ہے کہ نہر کا کھالینا کوئی مشکل یا ناگوار کام نہیں، لیکن اگر کوئی مجھ سے یہ کہے، کہ تم سے ملنا اور محبت کرنا چھوڑ دوں، تو یہ تجھ سے ہرگز ممکن نہیں ہو سکتا، گویا :-

موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے شہ ہے تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے شبنے

اسی طرح :-

سر اٹانے کے جو وعدہ کو مکر رچا ہا ہنسکے بولے کہ ترے سر کی قسم ہو سکو
 یہ شعر بھی دو متضاد معنی رکھتا ہے، ایک تو یہ کہ "تیرے سر کی قسم ہم تجھے

ضرور قتل کریں گے“ دوسرے یہ کہ ”ہمیں تیرے سر کی قسم ہے“ یعنی ہم نے تیرا قتل کرنا اپنے نزدیک حرام قرار دے لیا ہوا ہے، پہلی صورت میں بات کی تاکید اور عہد کا استحکام پایا جاتا ہے، اور دوسری حیثیت میں محبوب کی شوخ مزاحی، اور ناز و داد کی سرکشی ثابت ہوتی ہے: یہاں معنی محاورے اور مجاز کی رو سے ہوں گے!

اسی طرح ایک اور جگہ فرماتے ہیں :-

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے، دشت کو دیکھ کے گھریا د آیا
یہاں بھی شعر اگرچہ دو معنی رکھتا ہے، لیکن دونوں پہلو آپس میں متضاد واقع ہوئے ہیں، ایک معنی تو یہ ہوئے، کہ جب ہم نے دشت کی ویرانی کو دیکھا، تو خوف اور دہشت سے ہمیں گھر کی راحت اور خوشی کا احساس ہوا کہ بار خدا یا! قسمت ہمیں کیسی سر زمین میں لے آئی ہے کہ جہاں نہ انسان ہے، نہ انسان کی ذات، اور دوسرے معنی یہ ہیں، کہ دشت کی اس ویرانی کو دیکھ کر گھر کا نقشہ یاد آ گیا، کہ وہ بھی بربادی میں اس سے کسی طرح کم نہیں ہے،

پھر فرماتے ہیں :-

ترے سر و قامت سے اک قد آدم قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں
اس شعر کے بھی جہاں یہ معنی ہیں، کہ محبوب کا قد قیامت کے فتنے سے تیار ہوا، اس لئے وہ ایک آدمی کے برابر کم ہو گیا ہے، وہاں یہ بھی ہو سکتے ہیں، کہ قیامت کے فتنے ہی نے بجائے خود سمٹ کر محبوب کی شکل اختیار

کر لی ہے، دوسری صورت میں اس کا مفہوم میر مثنوی کا وہ شعر ہوگا جسے ہم پہلے بھی ایک جگہ ذکر کر آئے ہیں، یعنی :-

تفاوت قامت یا روقیامت میں کیا مثنوی وہی فتنہ ہو لیکن مایں در اسپانچے میں مثنوی ہے پھر فرماتے ہیں :-

ہیں معلوم کس کس کا ہو پانی ہوا ہوگا قیامت میں شکر آلودہ ہونا میری مثنوی کا اس شعر کے بھی ایک معنی تو یہ ہوئے، کہ عشاق تیرے گریہ کی تاب نہیں لاسکتے، اور انہیں تیرا بنجیدہ اور غمناک ہونا کسی حالت میں بھی گوارا نہیں، اس لئے اُن کا خون اس منظر کو دیکھ کے پانی پانی ہو گیا ہے،

اسی طرح دوسرے معنی یہ پیدا ہوئے کہ تیری پلکیں چونکہ ہر وقت خون آشامی میں مصروف رہتی ہیں، اور ان کی میل لپی ہی اسی سے ہے :-
 اک ایک قطرہ کا دینا پڑا حساب خون جگر و دیعت مژگانِ یار تھا
 — ہذا جن بے شمار لوگوں کا خون وہ اس وقت تک پنی چلی ہوئی ہیں،
 وہی اب آنسوؤں کی شکل میں منتقل ہو کر تیری آنکھوں سے بہہ رہا ہے،
 پھر فرماتے ہیں :-

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر بادہ نوشی ہے بادِ پیما فی
 یہ حقیقت میں بہار کا بیان ہے، ایک معنی اس کے یہ ہوئے، کہ اس
 موسم کی ہوا بھی اپنے اندر شراب کی سی تاثیر رکھتی ہے، پھر شراب کے پینے
 اور پیسیوں کے ضائع کرنے سے کیا فائدہ،

دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں، کہ باہر چل پھر کر ہوا کھانا گویا

شراب نوش کرنا ہے، پہلے معنی کے رُوسے ”بادِ پیہودن“ کے معنی
”کارِ فضولِ کردن“ ہونگے،

پھر کہتے ہیں :-
زندگی میں تو وہ محفل سو اٹھاتے تھے دیکھوں اب گئے پر کون اٹھاتا مجھے
یعنی جب میں زندہ تھا، تب تو میرا دوست ماتھ کپڑ کر مجھے محفل سے
اٹھا دیا کرتا تھا، لیکن اب، کہ میں مر چکا ہوں، دیکھے کون مجھے یہاں سے اٹھا کر
باہر بھیجتا ہے، دوسرے معنی یہ ہوئے، کہ میرے جنازے کو دیکھیں تو بھلا
آج کون اٹھاتا ہے،

اسی طرح ایک اور شعر ہے :-
ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک تھی سپند گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں
محبوب سے کہتا ہے، کہ غیر تو آج ہمیں ذلیل کر رہے ہیں، اور تو
چپکے سے کھڑا ہنستا ہے، یہ سلوک تو نے ہمارے ساتھ کیوں کر جاڑ رکھا،
جبکہ ابھی کل ہی کی بات ہے، کہ اگر فرشتہ بھی ہمارے سامنے گستاخی سے
پیش آتا، تو تو اسے بھی صبر کے ساتھ دیکھ نہیں سکتا تھا، گویا :-
آج کیوں کو انہیں اپنی اسیروں کی تھے کل ملک تیرا بھی دل نہرِ وفا کا باب تھا

یہ ایک طور پر محبوب سے رحم و شفقت کی درخواست کی جا رہی ہے، پھر
دوسرے معنی اور جو زیادہ قرینِ قیاس ہیں، یہ ہوئے کہ ”اے خدا! آج
ہماری حالت ایسی ابتر اور خراب کیوں ہو رہی ہے، جبکہ تو نے فرشتے
کی گستاخی اور حکمِ عدولی کو بھی آدم کے حق میں پسند نہیں کیا تھا“ یہ اس

آیت کی طرف اشارہ ہے کہ وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْا اِلَّا الْاِبْلِیْسَ الْجٰنِیَّ : ”اُس وقت کو یاد کیجئے، جبکہ فرشتوں کو آدم کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم سنایا گیا تھا، سوان سب نے سماءے حکم کی تعمیل کی، لیکن شیطان اس سے انکار کر بیٹھا، پس اس کفر و انکار کے عوض جو سلوک اُس کے ساتھ روا رکھا گیا، اُسے بھی ایک دُنیا جانتی ہے۔“

اس مفہوم کی رو سے مذکورہ شعر کا لہجہ اور بھی زیادہ شکائت آمیز ثابت ہوا ہے، اور مرزا کے اس دردناک شعر کو یاد دلاتا ہے، کہ :-

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

سہل متغ جہاں مرزا کے دیوان میں مشکل سے مشکل شعر ہیں، وہاں

آسان سے آسان اور صاف سے صاف غزلیں بھی موجود ہیں، جب وہ اس خاص انداز پر اتر آتے ہیں، تو ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ گویا ایک دریائے لطافت بہہ رہا ہے، اور پھر مضمون کی شعریت بھی کہیں فوت ہونے نہیں پاتی، مثال کے طور پر :-

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے	آخر اس درو کی دوا کیا ہے
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار	یا الہی یہ ماحیر کیا ہے
میں بھی مُنہ میں زبان رکھتا ہوں	کاش پوچھو کہ مہیا کیا ہے
جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود	پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں غمزدہ و عشوہ واد کیا ہے
 شکن زلف عنبریں کیوں ہے ننگہ چشم سرمہ سا کیا ہے
 سبزہ و گل کہاں سے آئیں ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے
 ہم کو ان سے وفا کی ہے امید جو نہیں جانتے وفا کیا ہے
 ہاں بھلا کر ترا بھلا ہو گا اور درویش کی صدا کیا ہے
 جان تم پر نثار کرتا ہوں میں نہیں جانتا دُعا کیا ہے
 میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
 مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

اسی طرح :-

کوئی اُمید بر نہیں آتی کوئی صورت نظر نہیں آتی
 موت کا ایک دن متین ہے نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
 آگے آتی تھی حال دل پہ منسی اب کسی بات پر نہیں آتی
 جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد پر طبیعت ادھر نہیں آتی
 ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپوں ورنہ کیا بات کہ نہیں آتی
 کیوں نہ چنچوں کہ یاد کرتے ہیں میری آواز کہ نہیں آتی
 داغ دل گر نظر نہیں آتا بُو بھی لے چارہ کہ نہیں آتی
 ہم دہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی
 مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی موت آتی ہے پر نہیں آتی
 کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب شرم تم کو مگر نہیں آتی

زورِ کلام ہم اس سے پہلے لکھ آئے ہیں، کہ ایک شاعر کے لئے زورِ بیان کا پایا جانا بھی نہایت ضروری ہے، چنانچہ غالب کا کلام اس صفت سے بھی عاری نہیں، بلکہ اکثر جگہ اس کے بہترین نمونے ملتے ہیں، ذیل کے اشعار میں دیکھئے، کہ کس قدر جوش اور وجد یہ پایا جاتا ہے :-

باز بچہٴ اطفال سے دنیا مے آگے ہوتا ہے شبِ روز تماشا مے آگے
اک کھیل ہے اونگہ سلیمان کے مرزدیک اک بات ہے، اعجازِ مسیحا مے آگے
جُز نام نہیں صُورتِ عالم مجھ منظور جُز وہم نہیں ہستیِ اشیاء مے آگے
ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مے بوندے گھستا ہے جہیں خاکِ دریا مے آگے
میت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا تے بھیجو تو دیکھ کہ کیا رنگ تیرا مے آگے
سچ کہتی ہو خود میں خود آ رہی ہوں بیٹھا ہے بُتِ اُنیسہ سیما مے آگے
پھر دیکھئے اندازِ گل افشانیِ گفتار رکھ دے کوئی پیامِ و صہبا مے آگے
نفرت کا گماں گذرے ہی میں شاکِ گذرا کیونکہ کہوں لو نام نہ انکا مے آگے
ایماں مجھ رو کے ہے تو کھینچے ہی مجھ کفر کعبہ مے بھیجے ہو کلیسا مے آگے
عاشق ہوں یہ مشتوقِ فوجی میرا کام مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مے آگے
خوش ہوتے ہیں پر وِیل میں میں نہیں جاتو آتی شبِ بھراں کی تماں مے آگے
ہو ج زن اک قلمِ خوں کاش ہی ہو آتا ہے ابھی دیکھئے کیا کیا مے آگے
گواہ تھ کو جنبش نہیں نکھوں میں دمِ ہر رہنے دو ابھی سا غر و مینا مے آگے
ہم پیشہ و ہم مشرب دہرا ہے میرا غالب کو بُرا کیوں کہ اچھا مے آگے

تسلسل اور روانی | ادب اور اُس کے لوازمات میں اسے بھی کلام کا ایک نہایت ضروری اور اہم جزو قرار دیا گیا ہے، اور حق تو یہ ہے، کہ ہمارے نزدیک بھی تسلسل کے بغیر شعر میں نہ تو وجد پیدا ہو سکتا ہے اور نہ موسیقی، بلکہ ایک آورد کا سار رنگ نمایاں ہو جاتا ہے، جو کسی لحاظ سے بھی قابلِ تعریف چیز نہیں!

چنانچہ مرزا کے دیوان میں تسلسل کے بھی بہترین نمونے دیکھنے میں آئے ہیں، اور ایسے موقع پر اُن کی طبیعت وہ روانی دکھاتی ہے جس کا ذکر انہوں نے خود ایک جگہ فرمایا ہے :-

بقدر شوق نہیں طرفِ تلناؤ غزل کچھ اور چاہیئے وسعتِ مربیاں کیلئے
ذیل کی غزل اس کیفیت کی بہترین منظر ہے، تعجب ہوتا ہے کہ مفہوم اور مدعا کے ایک ہوتے ہوئے بھی مرزا نے بیان میں اس قدر تنوع اور کشش کہاں سے پیدا کر لی، نمونہ ملاحظہ ہو :-

مَدّت ہوئی ہے یار کو کہاں کئے ہوئے	جویشِ قدحِ سحرِ بزمِ چراغاں کئے ہوئے
کرنا ہوں جمعِ پھر مگر نختِ نخت کو	عرصہ ہو اے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے
پھر وضعِ احتیاط سور کئے لگا ہے دم	برسوں ہوئے ہیں چاکِ گریباں کئے ہوئے
پھر گرمِ نالہ ہائے شرار ہے نفس	مَدّت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کئے ہوئے
پھر پیشِ جراتِ دل کو چلائے عشق	سامانِ صدر ہزارِ نمکداں کئے ہوئے
پھر بھر رہا ہوں خامیہ مژگاں بخونِ دل	سازِ چین طرازِ میواماں کئے ہوئے
باہر گر ہوئے میں دلِ نویدہ پھر رقیب	نظارہ و خیال کا سامان کئے ہوئے

دل پھر طواف کوئے ملامت کو چاہے
پھر شوق کہہ رہا ہے خریدار کی طلب
دوڑے ہی پھر ہر ایک گل لالہ خیال
پھر چاہتا ہوں نامہ ولد ارکھولنا
مانگے ہی پھر لسی کو لبِ یام پر ہوس
چاہے ہی پھر کسی کو مقابل پہ آرزو
اک نوبہار ناز کو تاکے ہی پھر نگاہ
پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی پڑی رہیں
جی ڈھونڈتا ہی پھر وہی فرصت کہ رات و
غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر خوش نشک سے
بیٹھ میں ہم تہیہ طوقاں کئے ہوئے

اور یہی انداز ایک دوسری جگہ :-

پھر کچھ اک دل کو بقراری ہے
پھر جگر کھودنے لگا ناخن
قبلہ مقصد نگاہ نیزار
چشم و لالہ حبس رسوائی
وہ ہی صد گن نالہ فرسائی
دل ہوائے خرام ناز سے پھر
جلوہ پھر عرض ناز کرتا ہے
سینہ جو یائے زخم کاری ہے
آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے
پھر وہی پردہ عساری ہے
دل خریدارِ ذوق خواری ہے
وہی صد گونہ اشک باری ہے
مخترستانِ بے قراری ہے
روزِ یازارِ جان سپاری ہے

پھر اُسی بے وفا پر مرتے ہیں پھر وہی زندگی ہماری ہے
 صنائعِ بدائع [مرزا کو لفظی مناسبات سے قدرتی طور پر نفرت تھی، اور وہ اس
 انداز کے جانی دشمن تھے، یہی وجہ ہے، کہ ان کے کلام میں محاورات بھی بہت
 کم پائے جاتے ہیں، اُردو شعراء میں محاورہ بندی کا جنون فوق کو خاص
 طور پر گھیرے ہوئے ہے، یہی وجہ ہے، کہ اکثر جگہ تصنیع کا رنگ پیدا ہو جاتا
 ہے، اور جہاں تصنیع نے دخل پایا، وہاں اثر مفقود، اور پھر لفظی مناسبات کیلئے
 تو تقریباً سبھی کی طرح جان دیتے ہیں، مرزا نے دانستہ کہیں بھی ایسا
 التزام نہیں کیا ہے، ہاں کہیں اتفاق سے کلام میں کوئی ایسی خوبی پیدا ہو بھی
 گئی ہے، تو اس سے معافی میں کوئی غلط پیدا نہیں ہوتا، بلکہ ائمہ فن کے
 نزدیک ایسی بے ساختگی اور لفظی یا معنوی صنعت کا شمار خاصین شعری میں
 ہوتا ہے،

بجٹوری مرحوم نے مرزا کے اُردو کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے جہاں اور بہت
 سی غیر ضروری تاویلوں اور بیہودہ موشگافیوں کو دخل دیا ہے، وہاں
 علمِ بدیع کی نسبت تحریر فرماتے ہیں :-

”قابلِ عزت ہیں وہ تمام فضلاء جنہوں نے علمِ صنائع و بدائع کو فروغ دیا
 ہے، لیکن اگر ان کی تمام کتابیں جلا دی جائیں، تو شعرا کو ذرا بھی نقصان نہیں ہے۔“
 سوال یہ ہے، کہ جب وہ تمام فضلاء جنہوں نے اس علم کو انتہائی کمال
 سے سونپ دیا ہے، عزت ہی کے مستحق تھے، تو ان کی نسبت ایسے گستاخانہ الفاظ

لے دیکھو محاسن کلام غالب ص ۱۶ مطبوعہ انجمن ترقی اُردو، ”

کو جائز کیوں سمجھا گیا؟۔ کاش مصنف نے لکھنے سے پہلے اپنے قلم کی اس آوازی اور بے راہ روی کا اندازہ کر لیا ہوتا؛ میں نے اس کتاب میں ہر جگہ شعر کے اس پہلو کو بھی اشارات سے واضح کیا ہے، یہاں مستقل طور پر مرزا کے دیوان سے بھی مثالیں پیش کئے دیتا ہوں، ناظرین خود اندازہ فرمائیں :-

صنعتِ تجنیس :-

دینہیں جرم نہیں دینہیں آستان نہیں بیٹھے ہیں بگدر پہ ہم غیر ہمیں ٹھاکوں یہاں دیر اور در میں تجنیس زائد و ناقص موجود ہے، اس طرح :-
بہت دنوں میں تغافل نے تیری بیداری وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے یہاں بھی نگہ اور نگاہ میں یہی صنعت موجود ہے، لطف یہ ہے کہ شاعر نے حسن کے استثناء اور عشق کی نیاز مندی کو انہیں دو الفاظ میں ظاہر کر دیا عاشق کے دل کو جو چیز پر واز دیتی ہے، وہ فی الحقیقت کسی کی ختم فسوں ز کا یہی نیم غمزہ ہے

صنعتِ اشتقاق :-

اصل شہود و شاید و مشہود ایک ہے حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حیا میں اس شعر میں شاید، مشہود اور مشاہدہ سب کے سب ایک ہی مصدر یعنی شہود سے مشتق واقع ہوئے ہیں، اور یہی اس صنعت کی غایت ہے،
صنعتِ تضاد :-

اب تو محروم جفا بھی ہیں ہم اللہ اللہ اس قدر دشمن اباب و قابو جانا

یہاں جفا اور وفا میں صنعت تضاد ہے ،

طباق سلبی :-

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی بلو داد یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے
طباق سلبی کے معنی ہیں ، 'امرونی کا جمع کرنا ، مثبت و منفی کے ساتھ'
اس لحاظ سے اس شعر میں ناکردہ اور کردہ کے پیش نظریہ صنعت موجود ہے
اسی طرح ایک اور شعر ہے :-

پلا دے اوک سو ساقی جو ہم سنو نفرت پیالہ گر نہیں دیتا نہ دشمنانے دے
یہاں بھی : دے اور دے اسی صنعت کے ماتحت ہیں ، ایک اور جگہ
کہتے ہیں :-

دل سے نکلا پتہ نکلا دل سے ہے ترے تیر کا پیکان عزیز
یہاں بھی نکلا اور نہ نکلا میں طباق سلبی موجود ہے ،
صنعت عکس :-

و فو را شک نے کا شانے کا کیا یہ رنگ کہ ہو گئے مرے دیوار و در و دیوار
یہاں الفاظ کی ایک ترتیب قائم کر کے پھر انہیں الٹ دیا گیا ہے ،
صنعت ترجمۃ اللفظ :-

لیتا ہوں کتبِ غم دل میں سبق ہنوز لیکن یہی کہ رفت گیا اور بُو د تھا
رفت کا ترجمہ کیا ، 'اور بُو د کا تھا' یہ دونوں ماضی کے صیغے ہیں ،
لف و نشر مرتب :- لغوی طور پر لفظ کے معنی ہیں لپیٹنا ، او
نشر کے معنی ہیں کھولنا ، شعر میں اس کا قرینہ یوں قائم رکھا جاتا ہے ، کہ

پہلے چند ایک اشیاء کو مرتب کر کے ان کی مناسبات کا حل اسی طور پر دوسرے مصرع میں کر دیا جاتا ہے، مثلاً :-

آتش و آب و باد و خاک نے لی وضع سوز و غم و درم آرام !
آگ کی خاصیت جلانا ہے، پانی کی خاصیت تر کرنا ہے، ہوا گریز کرتی ہے، اور خاک ایک جگہ پر قرار پکڑے ہوئے ہے، شاعر نے ان تمام خصوصیات کو یکے بعد دیگرے ایک مناسب ترتیب کے ساتھ ذکر کیا ہے،

پھر :-
لطف خرام ساقی و ذوق عدا چنگ یہ جنت نگاہ وہ فردوس گوش ہے
— کا شمار بھی اسی صنعت کے ماتحت ہوگا، اسی کی دوسری قسم :-
لف و نشر غیر مرتب ہے، اس کا امتیاز تو فقط نام ہی سے ظاہر ہے، بات یہاں بھی بالکل وہی ہے، لیکن ترتیب کا کوئی لحاظ نہیں، مثلاً :-

وال وہ غدر و عود نازیان سجا پاس وضع راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں بلاء کیوں
اس شعر میں محبوب کی نخوت اور اپنی خود داری کا ذکر کیا ہے، لیکن دوسرے مصرع میں مفہوم کی اصل ترتیب پہلے مصرع کی نسبت مختلف ہے، اسی طرح :-

باہر گرہوئے ہیں دل و دیدہ پھر قریب نظارہ و خیال کا ساماں کئے
خیال یا تصور کی نسبت دل سے ہے، اور نظارہ کی آنکھ کے

ساتھ، لیکن ظاہر ہے، کہ یہاں بھی ترتیب اپنی اصلی شکل پر قائم نہیں رہے پائی،

صنعت ایہام :-

اے کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک کون جتیا ہے تری زلف کے سر پہ تنک زلف اور سریہ دو الفاظ ایسے ہیں، جن سے ایہام پیدا ہوتا ہے، لیکن یہاں سر کے معنی کسی چیز کو تسخیر کرنے کے ہیں، روزمرہ کے مطابق جب ہم کہیں گے کہ ”نپولین نے اپنی افواج سمیت اس ہم کو سر کر لیا“ تو اس کے معنی یہ ہونگے، کہ اس نے فتح پائی، اور غلبہ حاصل کیا، اسی طرح مرزا کا مطلب بھی یہ ہے، کہ جہاں ایک مدت سے ہم نالہ و فساد کر رہے ہیں، اور اس شوخ پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا، وہاں خدا جانے کتنی عمریں اور درکار ہونگی، کہ ہم اسے اپنا مطیع اور فرمانبردار بنا سکیں، اسی طرح ایک اور شعر ہے :-

ہم سو عبث ہے گمان بخش خاطر خاک میں عشاق کے غبار نہیں ہے یہاں بھی خاک اور غبار سے ایہام پیدا ہوتا ہے، لیکن خاک کے معنی اس جگہ فطرت اور طبیعت کے ہیں، اس طرح غبار سے خفگی اور رنج کا مفہوم ثابت ہوتا ہے، پس شعر کا مطلب یہ ہوگا، کہ محبوب جو ہم پر خفگی کا گمان رکھتا ہے، یہ حقیقت میں غلط ہے، بلکہ عشاق کا شیوہ تو تسلیم و رضا ہے، محبوب سے خفا ہو جانا انہیں کسی حالت میں بھی زیب نہیں دیتا،

حسن و عشق کی اسی نوک جھونک پر خواجہ حافظ کے دو شعر یاد آ گئے
فرماتے ہیں :-

صبح دم مرغِ چمن با گلِ نونہا گفت ناز کم کن کہ درین باغ بے چوں تو شکفت
گلِ بجنبد کہ از راستِ زرخیم د لے ہیچ عاشق سخن تلخ بہ محشوق نلففت
صنعتِ جمع :-

بوئے گلِ نالہ دلِ دو چراغِ محفل جو زری بزم سے نکلا سو پریشیاں نکلا
یہاں تمام چیزوں کو ایک ہی صفت یعنی پریشانی میں یکساں طور پر
جمع کر دیا گیا ہے، اسی طرح ایک اور شعر ہے :-
نہند اُسکی ہر دماغ اسکا ہر اُتار میں تیری زلفیں جس بازو پر پریشیاں ہو گئیں
ظاہر ہے، کہ یہاں بھی لطفِ خواب کے تمام اسباب کو ایک ہی چیز یعنی
وصلِ محبوب سے مقید کر دیا گیا ہے،

صنعتِ تلمیح :-
عشق و دردِ دوری عشرت کہ خسر کیا تو ہم کو تسلیم نہ کو نامی فرما د نہیں
تلمیح کسی خاص واقعہ یا اصطلاح کی طرف اشارہ کرنے کو کہتے ہیں،
اس شعر میں فرہاد کے مشہور قصے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اسکے علاوہ :-
سب قیہوں سے ہونا خوش پر زناںِ مصر ہے زلیخا خوش کہ حوہا کنہاں ہو گئیں
اس میں بھی اسی واقع کو یاد دلایا گیا ہے، جبکہ زناںِ مصر نے زلیخا کو یہ
طعنہ دیا تھا، کہ تو ایک ملکہ ہو کر یوسف پر مری جاتی ہے، آخر وہ کونسا ایسا
پری جمال ہوگا، ہوش میں آ، اور خود کو سنبھال، پھر جب انہی عورتوں نے

یوسفؑ کو دیکھا، تو فرط حیرت سے انہیں اتنا بھی ہوش نہ رہا، کہ ہم پھل کاٹ رہی ہیں، حتیٰ کہ اپنے ہاتھ بھی شہید کر بیٹھیں،
حسنِ تحلیل :-

ہے وہی بدستی ہرزہ کا خود عذر خواہ جس کے جلوہ سے زمین و آسمان سر رہے
یہاں ہرزہ کے رقص کو بدستی سے تعبیر کیا ہے، یہ حسنِ تحلیل ہے،
القول بالموحِب :-

میں نے کہا کہ نرم ناز چاہی غیر سے تھی سُنکے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہیں
اس صنعت کا مطلب یہ ہے، کہ کسی شخص کے کلام کے معنی خلاف مراد
قائل لینا، چنانچہ ظاہر ہے، کہ مرزا نے رقیبوں کی نسبت کہا تھا، کہ
انہیں محفل سے نکال دیا جائے، لیکن اس شوخ چشمِ محبوب نے جان بوجھ
کہ خود مرزا کو اپنی محفل سے اٹھا دیا،
صنعتِ محمل الضامین :-

اس کا مطلب یہ ہے، کہ شاعر کا کلام دو متضاد معنی رکھتا ہو،

ذیل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

شعاعِ جوانی ہر اک حلقہ گرداب تھا	نشب کہ برقِ سوز دل سوزِ ہرہ ابراب تھا
گر سے یاں نپہ بالَش کفِ سیلاب تھا	داں کرم کو غدرِ بارش تھا عیانِ گیرم
یاں ہجومِ اشک میں تازگہ نایاب تھا	داں خود سرائی کو تھا موتی پرنے کا خیال
یاں رواں شرکانِ چشمِ تر سے خونِ نا تھا	جلوہ گل نے کیا تھا داں چرائی نا تھا
داں وہ فرقِ نازِ محبوبِ بَش کم خواب تھا	یاں سر پہ شورِ بجا بی سی تھا دیوار جو

یاں نفس کرتا تھا روٹن شمع بزم بخودی جلوہ گل وال بساط صحبتِ اجاب تھا
فرسجِ بنا عرشِ واصلِ فانی تھا فوجِ رنگ کا یاں نہیں سے آسمان تک سوختن کا باب تھا

ان میں سے ہر شعر اپنے اندر دو متضاد کیفیتیں رکھتا ہے، ایک مصرع میں اپنی زبوں حالی اور تباہی کا ذکر کیا ہے، تو دوسرے مصرع میں محبوب کی خوش ادائیگی اور عیش و عشرت کا نقشہ کھینچا ہے، یہ غزل حسنِ بیان کی ایک بہترین مثال ہے!

فلسفہ غم اکثر لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا ہے، کہ مرزا کا فلسفہ حیات ہنامتِ تلخ ہے، اور اس میں جگہ جگہ غم اور افسردگی کے آثار دکھائی ہیں، مثلاً :-

غم ہستی کا اس کیس ہو جو مرگِ علاج شمع ہر رنگ میں جلتی ہو سحرِ موت تک
قید حیاتِ بندِ غمِ اصل میں دونوں یک ہیں موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پا لے گا
نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیو بے صدا ہو جائیگا یہ سازِ ہستی ایک دن
ایک ہنگامے پہ موقوف ہو گھر کی رونق لوحِ غم ہی سہی نغمہ شادی نہ سہی
اور اسی طرح کی اور بہت سی مثالیں :- لیکن کیا ایک فلسفی کے نقطہ نظر سے ان باتوں میں انسانی زندگی کے لئے کوئی مفید سبق نہیں ہے؟ ہم کہیں گے کہ ایک صاحبِ بصیرت شمنص ان سے بھی کافی حد تک اپنے گیر کٹر اور جذبات کی اصلاح کر سکتا ہے، اور خاص کر ایسی حالت میں جبکہ خود مرزا نے بھی اسکی غائت پر بدرجہ اتم روشنی ڈالی ہو، اور وہ اس طرح کہ :-

انج سو خگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہر رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آسان ہو گئیں
اور صرف غالب ہی پر کیا موقوف ہے، دُنیا کے اور بہت سے شاعر بھی
اپنے اپنے انداز میں غم کو انسانی زندگی کا ایک جزو لا ینفک قرار دے چکے
ہیں، منجملہ اُن کے گوئے نے ہی کو دیکھ لیجئے، اپنے جذبہ عشق کی تجدید اور
استقرار کے لئے غم کو کتنی ضروری چیز سمجھتا ہے، چنانچہ ایک جگہ کہتا ہے:-
”قد اکرے وہ آنسو کبھی خشک نہ ہونے پائیں، جو اپنے اندر محبت کی ایک
دامی مسرت رکھتے ہیں، افسوس! جب ان میں سے ایک آنسو بھی خشک ہوئے
لگتا ہے، تو دُنیا کس قدر اُداس اور رنجائی ہوئی معلوم ہوتی ہے، گویا اس کی لُوح
مردہ ہو گئی، سوہاں، میری آرزو تو یہی ہے کہ غم بحرِ ایں میں بہنے والے آنسو کبھی
خشک نہ ہونے پائیں!“

دیکھا آپ نے؟ محبت کا جوش غم کی تلخی کو کس طرح فراموش کر دیتا
ہے، پھر ایک دوسری جگہ بھی سوال و جواب کے طور پر اس کی طبعی اور
نفسیاتی حیثیت پر یوں روشنی ڈالتا ہے:-

”اے دوست! یہ کیا بات ہے کہ تو غمناک حالت میں سر جھکائے بیٹھا
ہوئے، حالانکہ تیرے تمام رفیقِ شاداں دفرہاں دکھائی دیتے ہیں؟—
تیری آنکھوں سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے، کہ تو زار و قطار رویا ہے، وہ موج
کر دم کرائی ہیں، آخر اس بے قراری کا سبب کیا؟“

”ہاں! اگر میں رویا بھی ہوں، تو میرا یہ رونا تنہائی اور عزلت نشینی میں ہے
کہ جہاں سوائے میرے اور کوئی غمگسار موجود نہیں، یہ آنسو میرے لئے بہا رہا کی

سی نہکت اور تروتازگی لاتے ہیں، اور اس طرح میرے دل کو ہرقسم کی تشویش سے نجات مل جاتی ہے۔
گویا :-

رونے سے اے نیم ملامت نہ کر مجھے آخر کبھی تو عقدہ دل را کرے کوئی
تو اس لحاظ سے معلوم ہوا کہ طبیعت کی شگفتگی اکثر حالتوں میں نالہ و فریاد
اور گریہ و زاری پر موقوف ہے، اس سے پہلے بھی یہ فلسفہ ایک جگہ ذکر کیا
جا چکا ہے، اس مقصد کے لئے وہ شعر دوبارہ پیش کئے دیتا ہوں :-
دل میں پھر گریہ نے اک شعور اٹھایا غنا۔ آہ! جو قطرہ نکلا تھا سو طواف نکلا
اس کا مطلب یہ ہے کہ :-

سینہ کا داغ جو وہ نالہ کہ لب تک گیا خاک کا رزق جو وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا
نظیری کہتا ہے :-

خاطر بخیلہ گل و مل دانی شود ! غیر از گریستن غم دل را علاج نیست
اقبال نے بھی فطرت کے ان لطیف اور نازک تاثرات کو بڑی خوبی
سے الفاظ کا جامہ پہنایا ہے، چنانچہ بانگ درا میں ”فلسفہ غم“ ہی کے
زیر عنوان ایک جگہ فرماتے ہیں :-

گو سراپا کیفِ عشرت جو شرابِ زندگی اشک بھی دامن میں کٹتا ہو سجا بندگی
آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے :-

غم نہیں غم لوح کا اک نغمہ خاموش ہے جو سرود پر لبِ ہستی سے ہم آغوش ہو
اور بالآخر اس کے سب سے بڑے فائدے کو بھی نظر انداز نہیں کرنے

’یہ ہے‘ اور فرماتے ہیں :-

غم جوانی کو جگا دیتا ہے لطفِ خواب سے
سانہ یہ بیدار ہوتا ہے اسی مفراب سے

خاتمہ

بات میں سے بات پیدا ہوتی گئی، اور سلسلہ کلام نے بہت طول پکڑ لیا، اب قلم کا سفیر بھی آگے بڑھنے سے انکار کرتا ہے، اور میں خود بھی متوجہ ہوں، کہ :-

لکھتے نامہ لکھے گئے دفتر شوق نے بات کیا بڑھائی ہے

بس! اے میرے سچے مونس اور بھرم! بس! اب تھوڑی دیر کے لئے ٹھہر جا، اور ذرا تحمل سے کام لے، تیری وفا داری مسلم اور تیری جرأت و استقلال میں کوئی کلام نہیں، لیکن یاروں کی طبیعت کا بھی تو کچھ اندازہ کیا چاہیئے، مانا کہ قدرت ہمیشہ ایک نئی دنیا تعمیر کیا کرتی ہے، اور ذوق نمود ایک حالت پر قائم نہیں رہتا، لیکن وقت کا سیلان بھی تو وہ بلا کی طاقت ہے، کہ اُسے تباہ و برباد اور درہم برہم کر کے پھر سے نئی بنیادیں استوار کر دیتا ہے، ہاں، تو اس کے لئے خدا کے سامنے کیوں التجا نہ کروں کہ الہی! آسمان و زمین کی یہ تمام سختیں تو ایک ہی جست میں طے ہو گئیں، تب کہ اب تمنا کا دوسرا قدم کہاں سے لائوں ؟ :-

یا بکبشِ مدینہ منِ آرزوئے انقلاب یا دگرگوں کن نہادِ این مانِ این میں

یا چناں کن یا چنیں !

میرے جسم کے اندر تو نے گوشت کا ایک چھوٹا سا لوتھڑا تو پیدا کر دیا، لیکن بتا کہ اب اس کے قیامت خیز منگاموں کو سن بھالے گا؟ یہ آہ دنیا دل سمجھتی ہے جسے وہ دل نہیں پہنچے انسان میں اک منگامہ خاموش عشق ! اُف، عشق کی طاقت؟ اس کڑے ارضی کو پاش پاش کر دینے والی طاقت، خوفناک پہاڑوں کو بھی مسمار کر دینے والی قوت ! خیر پھر تو بھی دیکھ، زندگی کی تسخیر کا ذرا غور سے معائنہ کر۔ کچھ حرج نہیں، اگر عرصہ کائنات اس قدر محدود ہے، کوئی مضائقہ نہیں، اگر ستارے جگمگا کر نظر سے غائب ہو جاتے ہیں، موت کا خیال مجھے منسوب نہیں کر سکتا، لیکن ہاں تجھے بھی آنا ضرور سن لینا چاہیے :-

نشہ عشق کا اگر ذوق دیا تھا مجھ کو عمر کا تنگ نہ بنایا ہوتا
دل کو میرے خم و خنجا نہ بنایا ہوتا

غالب ! لے کہ اب میں تجھ سے رخصت ہوتا ہوں، اے مشرق کی زندہ جاوید ہستی ! اشکوں کا خراج مجھ عاجز سے قبول کر، یہ انس و نہ انسوں جنہیں میں نے جینوں نہیں، بلکہ رسول سے صرف تیرے ہی لئے اپنی آنکھوں میں محفوظ رکھا تھا ! یہ عقیدت کے چند قطرات، یہ نذر حقیر قبول کر لے، جو آرزو ایک ماہی بے آب کی مثل ہمیشہ سے مجھے ترپاتی رہی، وہ آج پوری ہوتی ہے، اور میں نے مقدور بھر تیری خدمت کر دی !

وہی تجھے سمجھیں گے، جو ایک نظر حقیقت شناس رکھتے ہیں، اور وہی تجھے اپنے سینوں میں جگہ دینگے، جو اپنے پہلو میں ایک درد مند دل لیکر اس دنیا میں آئے ہیں، اے ملکِ معانی کے پیغمبر! تو نے کہا، اور بجا طور پر کہا، کہ یارب وہ مجھ میں سمجھنے کی بات دے اور دل انکو جو دے مجکو زباں اور دل کا سوز بھی سہی، لیکن پہلے تجھ سا کوئی بالغ نظر تو پیدا ہو لے، پھر وہ تیرے کلام کو بھی سمجھ لیگا :

ترا چنانکہ توئی ہر کسے کج داند بقدر ہمت خودی کند استداک
تیرے حسن گفتار نے کائنات کے ذرے ذرے کو مدہوش کر دیا
ہوا ہے، روحیں تیرے نمود کے لئے بیابانِ اور تشنہ ہو رہی ہیں آئندہ
نسلیں تیرے انتظار میں ہیں، ابھی ایک دور گزر تو لینے دے، پھر
دیکھئے کیا ہوتا ہے :-

حسنِ آئینہ حق اور دلِ آئینہ حسن دلِ انساں کو ترا حسنِ کلام آئینہ
کیا کیئے اور کہاں تک تیری تعریف کرتے چلے جائیے، جس طرح ایک
حیدر چہرہ ہر قسم کی آرائش و زیبائش سے بے نیاز ہوا کرتا ہے، اسی طرح تیری
شاعری بھی کسی مدح و ستائش کی شرمندہ احسان نہیں !
نورِ غالب ! ایک دفعہ پھر نمودار ہو، اور اپنے ایک یزیدِ فقیہ کو جسکی نظریں
میرے تیرے لئے ٹھک رہی ہیں - جگہ جگہ ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہیں، اپنی تجلی اور
ایک روح افزا مٹکی سے لذتِ یاب ہو لینے دے - میں سراپا انتظار ہوں !

(حکمتِ برہان: محمد انجی خوشنویس لاہور)

کلیں

جامد

۱۔ اگر کسی نے اس کتاب کو پڑھا تو اس کا دل
جلاش و جلاش نہ ہوگا بلکہ اس کا دل
۲۔ اس کتاب سے جو شخص پڑھے وہ اس کا دل
۳۔ اگر کسی نے اس کتاب کو پڑھا تو اس کا دل
۴۔ اس کتاب سے جو شخص پڑھے وہ اس کا دل
۵۔ اگر کسی نے اس کتاب کو پڑھا تو اس کا دل
۶۔ اس کتاب سے جو شخص پڑھے وہ اس کا دل
۷۔ اگر کسی نے اس کتاب کو پڑھا تو اس کا دل
۸۔ اس کتاب سے جو شخص پڑھے وہ اس کا دل
۹۔ اگر کسی نے اس کتاب کو پڑھا تو اس کا دل
۱۰۔ اس کتاب سے جو شخص پڑھے وہ اس کا دل

دار

کتاب

کتاب

